Registered No. L. 4186

محرم ۱۳۶۰ھ — جلد ۱۸ — عدد ۱

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک۔ پونچھ روڈ۔ لاہور

قیمت سالانہ صہ — قیمت فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

(سلسلۂ سیاسی کشمکش حصہ سوم)

باھتمام ابوالاعلی مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس میں طبع ہو کر
دفتر ترجمان القرآن، مبارک پارک، پونچھ روڈ، لاہور سے شائع ہوا

اصلی مسلمانوں کیلیے ایک ہی راہِ عمل

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام تمام عالم انسانی کے لیے بنیادی اصلاح کا ایک پیغام اور عملی اصلاح کا ایک انقلابی پروگرام لیکر آیا ہے۔ اُسکا پیغام یہ ہے کہ تمام انسان اللہ وحدہٗ لاشریک کی حاکمیت تسلیم کریں حتیٰ کہ اُسکے حکم کے سوا ہر دوسرا حکم باطل ہوجائے۔ اور اسکا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں وہ ایک جتھا بنا کر اپنا پورا زور اس بنیادی اصلاح کو عملاً نافذ کرنے میں صرف کردیں، یہاں تک کہ اشخاص کی، خاندانوں اور طبقوں کی، قوموں اور نسلوں کی فرمانروائی اور جمہور کی حکومت خود اختیاری بالکلیہ مٹ جائے اور خدا کی سلطنت میں اُسکی رعیت پر صرف اُسی کا قانون عملاً جاری ہو۔ یہی پیغام اور یہی پروگرام انبیاء علیہم السلام ابتداء سے لیکر آتے رہے ہیں۔ اسی ایک مقصد پر انہوں نے اپنی تمام سعی و جہد کو مرکوز کیا ہے۔ اور مسلمان، جو انبیاء کے وارث اور انکے پیرو ہیں، اُنکے لیے بھی اِسکے سوا نہ کوئی دوسرا مقصد ہے اور نہ کوئی دوسری راہِ عمل۔ مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں پر مجھے جو کچھ اعتراض ہے وہ یہی ہے کہ اپنے آپکو مسلم (یعنی متبعین انبیاء) کہنے کے باوجود انہوں نے اس نصب العین اور اس راہِ عمل کو چھوڑ کر ایسے مقاصد اور طریقے اختیار کر لیے ہیں جنکو اسلام سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

اُن لوگوں کو چھوڑ کر جو اسلام کے علم سے بالکل ہی بے بہرہ ہیں، آج تک مجھے کوئی مسلمان، خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، ایسا نہیں ملا جس نے اس اعتراض کو سُن کر اصولی حیثیت سے صحیح تسلیم نہ کیا ہو۔ سب مانتے ہیں کہ بلاشبہ مسلمان کا اصلی کام یہی ہے اور اسی منزل کی طرف انبیاء علیہم السلام نے ہماری رہنمائی کی ہے۔ لیکن جواب میں دو مختلف سمتوں سے دو مختلف آوازیں آتی ہیں:

"آزادی پسند"[1] علماء اور اُنکے ہم خیال مسلمان اس راستہ پر آنے کی مشکلات یوں بیان فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اگر صرف مسلمان آباد ہوتے، یا مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہوتی، جیسی مصر ایران عراق وغیرہ ممالک میں ہے، تب تو ہمارے لیے آسان تھا کہ حکومت الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرتے، اور اس صورت میں اسکے قائم ہونے کا امکان بھی تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہاں ہم قلیل التعداد ہیں۔ اکثریت غیر مسلم ہے، حکومت الٰہیہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتی ہے، اور صرف مشترک وطنی حکومت ہی کے نصب العین تک اسکی نظر جا سکتی ہے۔ اوپر انگریزی حکومت بیٹھی ہے جو ہمیں اور غیر مسلم ہمسایوں کو ایک ساتھ دبائے ہوئے ہے۔ خود مسلمانوں کی آبادی کا کثیر حصہ بھی اخلاقی و اعتقادی حیثیت سے انتہائی تنزل کی حالت میں ہے۔ لہٰذا اسوقت جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ مشترک حکومت کے نصب العین کو قبول کر کے، غیر مسلموں کے ساتھ مل کر، انگریزی اقتدار سے نجات حاصل کر لی جائے۔ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد آزاد ہندوستان میں ہم اپنی قوتوں کو پھر مجتمع کرینگے اور اپنے اصلی نصب العین کے لیے جدوجہد شروع کر دینگے۔ اسکے سوا اور کوئی راستہ اسوقت قابلِ عمل نہیں ہے۔

دوسری طرف مسلم لیگ اور اُسکے ہم خیال لوگ اپنی مشکلات کو ایک دوسرے رنگ میں بیان کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں اول تو قلیل التعداد ہیں پھر تعلیمی اور معاشی حیثیت سے ہماری قوت بہت کم ہے۔ اور مزید براں ایک ایسی تنگ نظر اکثریت نے سیاسی اور معاشی قوتوں کے منابع پر تسلط حاصل کر لیا ہے جو عملاً تو ہم کو ایک الگ قوم سمجھ کر تعلیم حاصل کرنے اور پیٹ بھرنے کے ہر دروازے سے دور ہٹاتی ہے، مگر سیاسی اغراض کے لیے اصولاً ہمارے مستقل قومی وجود سے انکار کر دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ "ہم ہندوستانی قوم" میں شامل ہو کر یہاں ایک ایسی جمہوری حکومت قائم ہو جانے دیں جس میں سیاسی طاقت کے حصول کا ذریعہ محض ووٹوں کی کثرت ہو

[1] یہ بھی ایک طرفہ تماشا ہے کہ مغربی تصورات کی تقلید میں اب علماء تک آزادی اور غلامی کے الفاظ اس معنی میں استعمال کرنے لگے ہیں کہ غیر قوم کے تسلط میں ہونا "غلامی" اور اس سے نجات پا جانے کا نام "آزادی" ہے۔ حالانکہ اسلام کا تصور یہ نہیں ہے اسلام کے نزدیک خدا کے سوا ہر ایک کی، حتیٰ کہ اپنی خواہش نفس کی اطاعت بھی غلامی ہے اور اس سے رہائی پا کر صرف خدا کا مطیع ہونا آزادی ہے۔

اس مقصد میں اسکے کامیاب ہو جانے کے معنی یہ ہونگے کہ ہم اپنی قومی شخصیت ہی کو سرے سے کھو دیں، پھر بھلا حکومت الٰہیہ کا خواب کہاں دیکھا جا سکے گا۔ لہٰذا سرِدست اسکے سوا کوئی قابل عمل صورت نہیں ہے کہ جس طرح دنیا کی اور سب قومیں اپنی تنظیم کیا کرتی ہیں اسی طرح ہم بھی اپنی تنظیم کریں، اور دنیا میں جس طرح سیاسی لڑائی لڑی جاتی ہے اسی طرح ہم بھی لڑکر سب سے پہلے اُن علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اُسی جمہوری تصور کے مطابق جو انگریزی تصور جمہوریت کے تحت بنتا ہے، اپنی حکومت قائم کریں۔ بعد میں جب اختیارات ہمارے ساتھ میں آجائینگے تو ہم مسلمانوں کی تعلیم اور انکی اخلاقی و تمدنی حالت کو درست کر کے رفتہ رفتہ حکومت جمہوریہ کو حکومت الٰہیہ میں تبدیل کر لینگے، اور اللہ نے چاہا تو پھر باقی ہندوستان کی بازیافت کے لیے بھی جدو جہد کرتے رہینگے۔

بظاہر دونوں فریقوں کے خیالات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر انہی دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن مشکلات کا یہ لوگ ذکر کرتے ہیں ان میں قطعاً کوئی وزن نہیں ہے، بلکہ خود یہی بات کہ حکومت الٰہیہ کے راستہ میں انکو اس نوعیت کی مشکلات نظر آتی ہیں، اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ انہوں نے اسلامی تحریک کے مزاج اور اس کے طریق کار Technique کو سرے سے سمجھا ہی نہیں۔ زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں، اگر اس تحریک کی تاریخ ہمارے سامنے ہو تو بادی النظر ہی میں ان عذرات کی غلطی نمایاں ہو جاتی ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی رسول آیا ہے، اکیلا ہی آیا ہے۔ اقلیت اور اکثریت کا کیا سوال ہو، وہاں سرے سے کوئی "مسلمان قوم" موجود ہی نہ تھی۔ ایک فی قوم بلکہ ایک فی دنیا کی حیرت انگیز اقلیت کے ساتھ رسول یہ دعویٰ لیکر اُٹھتا ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنے آیا ہوں۔ چند گنے چنے آدمی اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور یہ آٹے میں نمک سے بھی کم اقلیت، حکومت الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ اکثریت کا سمندر اسکے ساتھ جو کچھ سلوک کرتا ہے، اسکے مقابلہ میں ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت کے اُس قہر و تسلط کی سرے

سے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے جسکا نوحہ کرتے کرتے ہمارے "مسلم قوم پرست"[۱] بھائیوں کے آنسو خشک ہوئے جاتے ہیں۔ دفتروں کی ملازمت، منڈیوں کے کاروبار اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے معاملات کا کیا ذکر، وہاں سانس لینے کا حق بھی اس اقلیت کو نہیں دیا جاتا تھا جو حکومت، خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی، جس پنجۂ ظلم و شکنجۂ قہر میں اُنکو کستی تھی، اُسکو کسی معنی میں بھی ہندوستان کے اُن انگریز فرمانرواؤں کے برتاؤ سے تمثیل نہیں دی جاسکتی جنکے ظلم و جور کا رونا ہمارے "آزادی پسند" بھائی رات دن رویا کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی کچھ ضروری نہ تھا کہ بہرحال رسول اور اصحاب رسول حکومت الٰہیہ قائم کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے ہوں۔ بارہا وہ اس مقصد میں ناکام ہوئے ہیں، اُنکو اور اُنکے ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا ہے، اور خدائی کے جھوٹے مدعیوں نے اپنی دانست میں اس تحریک کا قلع قمع کر کے چھوڑا ہے، مگر اسکے باوجود جو لوگ اللہ پر ایمان لائے تھے، اور جن کے نزدیک کرنے کا کام بس یہی تھا، انہوں نے آخری سانس تک اسی مقصد کے لیے کام کیا، اور کسی ایک نے بھی اکثریت کا یا حکومت کا رنگ دیکھ کر، یا وقتی و مقامی مشکلات کا خیال کر کے دوسرے راستوں کی طرف ادنیٰ التفات تک نہ کیا۔

پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس تحریک کو اٹھانے اور چلانے کے لیے خارج میں کسی سامان اور ماحول میں کسی سازگاری کی ضرورت ہے۔ جس سامان اور جس سازگاری کو یہ لوگ ڈھونڈتے ہیں وہ نہ کبھی فراہم ہوا ہے نہ فراہم ہوگا۔ دراصل خارج میں نہیں بلکہ مسلمان کے اپنے باطن میں ایمان کی ضرورت ہے، اس قلبی شہادت کی ضرورت ہے کہ یہی مقصد حق ہے، اور اس عزم کی ضرورت ہے کہ میرا جینا اور مرنا اسی مقصد کے لیے ہے۔ یہ ایمان، یہ شہادت، یہ عزم موجود ہو تو دنیا بھر میں ایک اکیلا انسان یہ اعلان کرنے کے لیے کافی ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اُسکی پشت پر کسی منظم اقلیت یا کسی حکومت خود اختیاری رکھنے والی اکثریت کی قطعاً کوئی حاجت نہیں۔ نہ اس امر ہی کی کوئی حاجت ہے کہ اُس کا ملک پہلے بیرونی قوم کے تسلط سے آزاد ہو جائے۔ بیرونی قوم کیا، اور گھر کی قوم کیا، اللہ کے سوا دوسروں کی حاکمیت ماننے والے سب انسان اسکے لیے

۱؎ یعنی مسلم قومیت کے پرستار۔

یکساں ہیں۔ سب کی اسی سے اور اسکی سب سے یکساں لڑائی ہے مسیحؑ سے رومیوں نے جو کچھ برتاؤ کیا، اس سے زیادہ ہولناک برتاؤ وہ تھا جو ابراہیمؑ سے انکی اپنی قوم نے کیا۔

یہ تو وہ بات ہے جو بادی النظر میں، ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جس نے قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہے۔ لیکن ذرا زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس نوعیت کی مشکلات کو یہ لوگ اپنی راہ میں حائل پا رہے ہیں وہ دراصل ایک قوم کی مشکلات ہیں نہ کہ ایک تحریک کی۔ جہاں ایک قوم اپنی زندگی اور اپنی قومی اغراض کے لیے جدوجہد کر رہی ہو وہاں تو بلاشبہ اسی قسم کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ اُسکے لیے ان سوالات میں بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ جس ملک میں وہ آباد ہے وہاں اسکی تعداد کتنی ہے؟ اس میں تنظیم ہے یا نہیں؟ اسکی تعلیمی حالت کیسی ہے؟ اسکی معاشی حالت کیسی ہے؟ اسکے اوپر ایک پتھر کا بوجھ ہے یا دو پتھروں کا؟ انہی سوالات کے جواب پر اسکا مستقبل منحصر ہوتا ہے، اور انہی سوالات کے لحاظ سے اسکو اپنی پالیسی متعین کرنی پڑتی ہے۔ مگر ایک اصولی تحریک جو کسی خاص قوم کی اغراض سے وابستہ نہ ہو بلکہ انسانی زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے ایک دعوت لیکر اُٹھے، اسکے سامنے ان سوالات میں سے کوئی سوال بھی نہیں ہوتا۔ اُسکے مسائل کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ اُسکی کامیابی و ناکامی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اسکے اصول بجائے خود معقول ہیں یا نہیں؟ وہ انسانی زندگی کے مسائل کو کہاں تک حل کرتے ہیں؟ وہ بالعموم انسانی فطرت کو کس حد تک اپیل کرتے ہیں؟ اور اسکی طرف دعوت دینے والے خود اسکی پیروی میں کتنے مخلص اور کتنے صادق العزم ہیں؟

مسلمانوں کو جو کچھ بھی پریشانی پیش آرہی ہے اسکی اصلی وجہ یہی ہے کہ انکے سوچنے والے دماغوں نے اپنی حیثیت کو ان دو مختلف حیثیتوں کے اندر خلط ملط کر دیا ہے۔ کبھی تو یہ اُن عزائم اور مقاصد کا اظہار کرتے ہیں جنکا تعلق اسلامی تحریک سے ہے، اور انکی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک اصولی تحریک کے پیرو اور داعی ہیں۔ اور کبھی یہ محض ایک قوم بنکر رہ جاتے ہیں، اُس طرح سوچنے لگتے ہیں جس طرح قومیں سوچتی ہیں، ایسے مسائل میں اُلجھ جاتے ہیں جو صرف قوموں ہی کو پیش آتے ہیں، اور اپنے اس طرزِ فکر کی وجہ سے اُن مشکلات کو

سدِّ راہ پاتے ہیں جو محض قومی مقاصد ہی کے لیے سدِّ راہ ہوا کرتی ہیں۔ اِن لوگوں نے آج تک اِن دونوں حیثیتوں کے فرق کو نہیں سمجھا، نہ واضح طور پر فیصلہ کیا کہ در اصل یہ ہیں کیا، اسی لیے یہ کوئی ایسی پالیسی ابھی تک اپنے لیے متعین نہ کر سکے جو تناقض سے خالی اور الجھاؤ سے پاک ہو۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ قومیت اور قومی اغراض قابلِ تبلیغ چیزیں نہیں ہیں۔ مثلاً جرمنیت، اطالویت، انگریزیت، یا ہندوبت کے متعلق کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ انکی طرف دوسروں کو دعوت دی جاسکتی ہے۔ یہ کوئی اصول نہیں ہیں کہ ہر انسان کے سامنے انکو پیش کیا جاسکے۔ یہ تو نسل، تاریخ اور تمدن کے بنے ہوئے بے لچک دائرے ہیں۔ ان دائروں کے مفاد اور مقاصد سے جو کچھ بھی دلچسپی ہوسکتی ہے اُنہی لوگوں کو ہوسکتی ہے جو ان دائروں کے اندر پیدا ہوئے ہوں۔ دوسرے دائروں کے لوگوں کو اِن سے دلچسپی ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایک جرمن اپنی جرمنیت کی بنیاد پر کوئی کام کرنا چاہے تو لامحالہ وہ جرمنوں ہی سے ہمدردی و اعانت کی توقع کر سکتا ہے۔ انگریز کو کیا پڑی ہے کہ جرمنیت کی زندگی یا اسکی برتری کے معاملہ میں اسکا ساتھ دے۔ جرمنوں کا بول بالا کرنے کی تڑپ تو صرف جرمنوں ہی میں پیدا ہوسکتی ہے، اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ انکے مقابلہ میں انگریز بھی متحد ہو کر اپنا بول بالا کرنے یا رکھنے کے لیے سینہ سپر ہو جائیں۔ یہ تو ضرور ممکن ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے بعض افراد کو ناجائز ذرائع سے خرید کر اپنا آلۂ کار بنالیں، مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ انگریز جرمنیت پر ایمان لاکر جرمنوں کا ملی حمیم بن جائے یا جرمن انگریزیت اختیار کر کے انگریزوں کا حامی و ناصر بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دو قوموں کے درمیان موافقت ہوتی ہے وہاں محض خود غرضی کی موافقت ہوا کرتی ہے اور صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک خود غرضی اسکی مقتضی ہو۔ اور جہاں انکے درمیان کشمکش و مزاحمت ہوتی ہے وہاں دونوں کو صرف اپنی قومی طاقت، اپنی تنظیم، اپنے معاشی وسائل، اپنی تعداد، اور اپنے آلاتِ جنگ ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے جو قوم کمزور ہو وہ پس جاتی ہے اور جو طاقتور ہو وہ اسے پیس ڈالتی ہے۔ جرمنی کے مقابلہ میں پولینڈ، ڈنمارک، ناروے، ہالینڈ، بلجیم اور فرانس کیوں مغلوب ہو گئے؟ فن لینڈ اور رومانیا

کو روس اور جرمنی سے کیوں دبنا پڑا؟ اسی لیے کہ مقابلہ ایک قوم اور دوسری قوم کا تھا۔ دونوں طرف قومیتیں تھیں۔ لہٰذا جسکی قومیت تعداد اور آلات و وسائل اور تنظیم میں بڑھی ہوئی تھی اُس نے کمزور کو دبا لیا۔ کوئی فریق بھی خالص انسانیت کی بنیاد پر ایسے اصول لے کر نہ اٹھا تھا کہ مخالف فریق کے انسانوں کو اپیل کرتا اور یہ ممکن ہوتا کہ خود دشمنوں میں سے اسکو دوست ملتے چلے جاتے۔

یہ ہوتی ہے ایک قوم کی حیثیت۔ اب غور کیجیے کہ فی الحقیقت کیا مسلمانوں کی حیثیت اس دنیا میں یا اس ہندوستان میں یہی ہے؟ کیا ہم محض نسل، تاریخ اور موروثی تمدن کا بنایا ہوا ایک ایسا گروہ (Group) ہیں جسکی قومیت دنیا کی تمام قومیتوں کی طرح ناقابلِ تبلیغ ہو؟ کیا ہمارے مقاصد کی نوعیت بھی اپنی قومی اغراض و مقاصد کی سی ہے جن پر دوسری قوموں کا ایمان لانا فطرۃً غیر ممکن ہوتا ہے؟ کیا ہمارے مقاصد اُسی قسم کے قومی مقاصد ہیں جنکا حصول صرف ایک قوم کی تعداد، تنظیم اور وسائل ہی پر موقوف ہوتا ہے؟ کیا وہ اسلامی حکومت جس کا ہم نام لیا کرتے ہیں محض ایک قومی ریاست (National state) ہے جسکے قیام کی بنیاد ایک قوم کی کثرت تعداد ہوا کرتی ہے؟ کیا قلیل التعداد ہونے کی صورت میں ہماری حیثیت واقعی ایک قومی اقلیت (National minority) کی رہ جاتی ہے جسکے لیے اکثریت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے یا اپنی انفرادیت کے تحفظ کی تدبیریں اختیار کرنیکے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا؟ کیا حقیقت میں دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ہمارے لیے بھی آزادی کا یہی مفہوم ہے کہ غیر قوم کی حکومت سے نجات حاصل ہو جائے؟ اور کیا اپنی قوم کی حکومت یا اپنے اہلِ وطن کی حکومت قائم ہو جانا ہمارے مقاصد کے لیے بھی ضروری ہے؟

اگر واقعی یہی ہماری حیثیت ہے، تو بلاشبہ وہ سب کچھ صحیح ہے جو مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اسوقت کر رہی ہیں۔ غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد بھی صحیح، برطانوی حکومت اور دیسی ریاستوں کا سہارا لیکر ہندو امپیریلزم کا مقابلہ بھی صحیح، فوج میں اور سرکاری ملازمتوں میں اور انتخابی مجالس میں اپنی نمائندگی کا جھگڑا بھی صحیح، مسلم ریاستوں کی حمایت بھی صحیح، تقسیم ملک کا مطالبہ بھی صحیح، خاکساروں کی فوجی تنظیم بھی صحیح، اور وہ مسلم قوم پرستی

بھی صحیح جسکی بنا برحق اور اصول سے قطع نظر کر کے ہر اُس فائدے کو دانتوں سے پکڑا جاتا ہے جو مسلمان قوم یا مسلمان اشخاص کو حاصل ہوتا ہو۔ غرض یہ سب کچھ صحیح ہے کیونکہ قومیت کا آئین یہی ہے، قومیں یونہی کام کیا کرتی ہیں، اور ایک قوم جو کسی اصول کی علمبردار نہیں بلکہ محض اپنی قومی بہتری کی خواہشمند ہو، ان تدابیر کے سوا آخر اور کیا تدبیریں اختیار کر سکتی ہے؟ البتہ ان سب چیزوں کے ساتھ اگر کوئی بات غیر صحیح ہے تو وہ ہماری یہ خوش فہمی کہ یہ حیثیت اختیار کرنے کے بعد بھی ہم اس زمین پر حکومت الٰہیہ قائم کر سکیں گے حالانکہ اس حیثیت میں یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو ہی نہیں سکتا۔

دراصل ایک ملک پر نہیں بلکہ ساری دنیا پر چھاجانے کی قوت اگر ہے تو وہ صرف ایک ایسی اصولی تحریک ہی میں ہے جو انسان کو بحیثیت انسان کے خطاب کرتی ہو اور اسکے سامنے خود اسکی اپنی فلاح کے فطری اصول پیش کرتی ہو۔ قومیت کے برعکس ایسی تحریک ایک تبلیغی طاقت ہوتی ہے۔ قومیت کے حصار، نسلوں کے تعصبات، قومی ریاستوں کے مضبوط بند، کوئی چیز بھی اسکا راستہ نہیں روک سکتی۔ وہ ہر طرف، ہر جگہ نفوذ کرتی چلی جاتی ہے۔ اسکی طاقت کا انحصار اپنے پیرووں کی تعداد یا انکے وسائل پر نہیں ہوتا۔ ایک اکیلا آدمی اسکو چلانے کے لیے کافی ہے۔ پھر وہ خود اپنے اصولوں کی طاقت سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ اپنے دشمنوں میں سے دوست پیدا کرتی ہے۔ سب قوموں میں سے آدمی ٹوٹ ٹوٹ کر اسکے جھنڈے کے نیچے آنے لگتے ہیں اور وسائل اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ جو فوجیں اس سے لڑنے آتی ہیں ان پر وہ صرف اپنی توپ و تفنگ سے ہی آتش باری نہیں کرتی بلکہ اپنی تعلیم اور اپنے اصولوں کے تیر بھی چلاتی ہے۔ خون کے پیاسے دشمنوں میں سے وہ اپنے سرگرم حامی ڈھونڈ نکالتی ہے۔ سپاہی، جنرل، ماہرین فنون، سرمایہ دار، صناع اور کاریگر سب انہی میں سے اسکو مل جاتے ہیں اور بے سروسامانی میں سے ہر قسم کا سامان نکلتا چلا آتا ہے۔ قومیتیں اسکے سیلاب کے مقابلہ میں کبھی نہیں ٹھیر سکتیں۔ بڑے بڑے پہاڑ اسکے سامنے آتے ہیں اور نمک کی طرح پگھل پگھل کر اس آب رواں میں جذب ہو جاتے ہیں۔ اُسکے لیے اقلیت اور اکثریت کے سارے سوالات بے معنی ہیں، وہ

اسکی ہرگز محتاج نہیں ہوتی کہ کسی منظم اور بادسیلہ قوم کی طاقت اُسکی پشت پر ہو۔ وہ قومی حکومت قائم کرنے نہیں اٹھتی کہ قومیں اس کی مزاحمت کرسکیں۔ اُسے تو ایک ایسے اصول کی حکومت قائم کرنی ہوتی ہے جو سب قوموں کے لوگوں کی فطرت کو اپیل کرتا ہے۔ جاہلی تعصبات کچھ دیر تک اس سے لڑتے رہتے ہیں، مگر جب فطرت انسانی پر لگا ہوا زنگ چھوٹتا ہے تو وہ کیفیت ہوتی ہے کہ

همه آهوانِ صحرا سرِ خود نهاده بر کف

بامید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

مسلمان قرآن اور سیرت رسول کے آئینے میں اپنی صورت دیکھیں۔ جس چیز کی وجہ سے وہ اپنے آپکو مسلمان کہتے ہیں، کہیں وہ اسی نوع کی تحریک تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ قوموں کے درمیان رہتے رہتے اور انہی جیسی تعلیم و تربیت پاکر اپنی اصلی حیثیت بھول گئے ہوں اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو قوم کہتے کہتے وہ سب حدود بندیاں بھی انھوں نے اپنے خیال میں خود اپنے اوپر عائد کرلی ہوں جو ایک قلیل الوسائل قوم کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔

اگر واقعہ یہی ہے اور مسلمانوں کی اصلی حیثیت ایک عالمگیر اصولی تحریک کے پیرووں اور داعیوں کی ہے تو وہ سارے مسائل یک قلم اُڑ جاتے ہیں جن پر اب تک مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی رہنما وقت ضائع کرتے رہے ہیں۔ پوری صورت حال بالکل بدل جاتی ہے مسلم لیگ، احرار، خاکسار، جمعیت العلماء اور آزاد کانفرنس، سب کی اس وقت تک کی تمام کارروائیاں حرف باطل کی طرح محو کر دینے کے لائق ٹھیرتی ہیں۔ نہ ہم قومی اقلیت ہیں، نہ آبادی کے فی صدی تناسب پر ہمارے وزن کا انحصار ہے، نہ ہندووں سے ہمارا کوئی قومی جھگڑا ہے، نہ انگریزوں سے وطنیت کی بنیاد پر ہماری لڑائی ہے، نہ وہ حکومت ہمارے کسی کام کی ہے جو انگریزی حاکمیت کے بجائے جمہور کی حاکمیت پر مبنی ہو، نہ اُن ریاستوں سے ہمارا کوئی رشتہ ہے جہاں نام نہاد مسلمان خدا بنے بیٹھے ہیں، نہ اقلیت کے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے،

نہ اکثریت کی بنیاد پر ہمیں قومی حکومت مطلوب ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں، بندوں کی حاکمیت ختم ہو جائے اور حکومت اُس قانونِ عدل کی قائم ہو جو اللہ نے خود بھیجا ہے۔ اس مقصد کو ہم انگریز، والیان ریاست، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی اور مردم شماری کے مسلمان، سب کے سامنے پیش کرینگے۔ جو اسے قبول کرے گا وہ ہمارا رفیق ہے، اور جو اس سے انکار کرے گا اس سے ہماری لڑائی ہے بلالحاظ اس کے کہ اس کی طاقت کتنی ہے اور ہماری کتنی۔

یہ حیثیت اختیار کرنے اور اس تحریک کو لے کر اُٹھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے شخصی اور قومی مفاد و اغراض کو بھول جائیں، تمام تعصبات سے بالاتر ہو جائیں، اور اُن چھوٹی چھوٹی چیزوں سے نظر ہٹالیں جن سے ہمارے حقیر دنیوی فوائد کا تعلق ہے۔ اگر ہم میں ہندوستانیت کا تعصب ہوگا تو فطری بات ہے کہ انگریز اور ہر غیر ہندوستانی کے کان ہماری دعوت کے لیے بہرے ہو جائیں۔ اگر ہم نام نہاد مسلم قومیت کے تعصب میں مبتلا ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندو یا سکھ یا عیسائی کے دل کا دروازہ ہماری پکار کے لیے کھل جائے۔ اگر ہم حیدر آباد، بھوپال، بہاول پور اور رام پور جیسی ریاستوں کی حمایت محض اس لیے کریں کہ انکے رئیس مسلمان ہیں اور ان سے مسلمانوں کو کچھ معاشی سہارا مل جاتا ہے تو کوئی احمق ہی ہوگا جو اسکے بعد بھی یہ باور کرلیگا کہ ہم اسلام کے نظریۂ سیاسی پر ایمان رکھتے ہیں اور واقعی حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہمارا نصب العین ہے۔ اگر ہم غیر مسلم حکومت کی ملازمت اور غیر اسلامی جمہوری ادارات میں مسلمانوں کی نمائندگی پر جھگڑا کریں تو ہماری اس آواز میں کوئی وزن باقی نہ رہے گا کہ ہم اصولِ اسلام کی فرمانروائی قائم کرنے اُٹھے ہیں۔ اگر ہم تناسب آبادی کے لحاظ سے تقسیمِ ملک کا مطالبہ کریں تو غیر مسلموں کو ہم میں اور خود اپنے آپ میں سرے سے کوئی فرق ہی محسوس نہ ہوگا کہ وہ اپنا مقام چھوڑ کر ہماری دعوت پر لبیک کہنے کی کوئی ضرورت سمجھیں۔ اگر ہم غیر اسلامی اصول پر مشترک

وطنی حکومت قائم کرنے میں حصہ لیں تو ہمارے اس فعل میں اور ہماری اُس دعوت میں ایسا صریح تناقض ہوگا کہ ہماری صداقت کیا معنی، صحت عقل تک مشتبہ ہو کر رہ جائیگی۔ اس راستہ پر چلنے کے لیے ہمیں یہ سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔ بلاشبہ اس سے ہمیں بہت نقصانات پہنچیں گے، مگر ایسے نقصانات اٹھائے بغیر اسلامی تحریک کبھی چلی ہے نہ کبھی چل سکتی ہے۔ جو کچھ جاتا ہے جانے دو۔ سیدنا مسیح کے بقول جبہ جاتا ہے تو کرتا بھی چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تب ہی خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو سکے گی۔

اسلام کی راہِ راست اور اس سے انحراف کی راہیں

مسلمانوں میں سے جو لوگ پاکستان کے نصب العین پر اپنی نظر جمائے ہوئے ہیں، اور جو انگریزی حکومت سے ہندوستان کی آزادی پر اپنی آئندہ کی تمام امیدوں کا انحصار رکھتے ہیں، اور جو اِن دونوں کے درمیان مختلف راہیں تلاش کر رہے ہیں، ان سب کے اندر ایک چیز مجھے مشترک نظر آتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام کے اصلی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے سے یہ سب لوگ جھجکتے ہیں۔ مشکلات کا ایک بہت بڑا پہاڑ انکو اس راستے میں حائل نظر آتا ہے اور اُس کو دور سے دیکھ کر یہ دائیں یا بائیں جانب مُڑ جاتے ہیں تاکہ پھیر کے راستوں سے نکل جائیں۔ حالانکہ میں علیٰ وجہ البصیرت یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی نصب العین تک کسی پھیر کے راستے سے پہنچنا غیر ممکن ہے۔ اسکی طرف اگر پیش قدمی کی جاسکتی ہے تو براہِ راست ہی کی جاسکتی ہے، اور جو مشکلات اس راستہ میں نظر آتی ہیں وہ ناقابلِ عبور نہیں ہیں بلکہ بہر وقت قابلِ عبور ہیں بشرطیکہ انکو صحیح طور سے سمجھنے اور دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

اوپر کے فقرے میں جو مجمل دعوےٰ میں نے کیا ہے اب میں اس کا تجزیہ کر کے ایک ایک جزو پر الگ الگ بحث کرونگا۔

۱- اصل اسلامی نصب العین کیا ہے؟

۲- اسکی طرف پیش قدمی کا سیدھا راستہ کونسا ہے؟

۳- اس راستہ میں جو مشکلات نظر آتی ہیں وہ کیا ہیں؟

۴- ان مشکلات کو دیکھ کر پھیر کے راستے کونسے اختیار کیے جا رہے ہیں؟

۵۔ ان مختلف راستوں میں غلطی کیا ہے اور یہ اصل مقصود تک کیوں نہیں پہنچا سکتے؟

۶۔ مشکلات کی حقیقی نوعیت کیا ہے اور وہ کس طرح دور ہو سکتی ہیں؟

یہ سوالات ہیں جن پر مجھے اس مضمون میں مختصراً بحث کرنی ہے۔

۱۔ اسلامی نصب العین

پہلے سوال کا جواب قرآن مجید میں جو کچھ دیا گیا ہے وہ یہ ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔

"وہی ہے (یعنی اللہ) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسکو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے خواہ یہ کام مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو"

اس آیت میں الھدیٰ (ہدایت) سے مراد دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ ہے انفرادی برتاؤ، خاندانی نظام، سوسائٹی کی ترکیب، معاشی معاملات، ملکی انتظام، سیاسی حکمت عملی، بین الاقوامی تعلقات، غرض زندگی کے تمام پہلوؤں میں انسان کی زندگی کے لیے صحیح رویہ کیا ہونا چاہیے، یہ چیز اللہ نے اپنے رسول کو بتا کر بھیجا ہے۔

دوسری چیز جو اللہ کا رسول لے کر آیا ہے وہ دینِ حق ہے۔ دین کے معنی اطاعت کے ہیں کیش اور مذہب کے لیے جو دین کا لفظ استعمال ہوتا ہے یہ اس کا اصل معنی موضوع لہ نہیں ہے بلکہ اسکو دین اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں بھی انسان خیال و عمل کے ایک خاص سسٹم کی اطاعت کرتا ہے۔ ورنہ دراصل دین کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو زمانۂ حال میں لفظ "اسٹیٹ" کے معنی ہیں۔ لوگوں کا کسی بالاتر اقتدار کو تسلیم کر کے اسکی اطاعت کرنا، یہ "اسٹیٹ" ہے۔ یہی دین کا مفہوم بھی ہے، اور "دین حق" یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کی، خود اپنے نفس کی اور تمام مخلوقات کی بندگی و اطاعت چھوڑ کر صرف اللہ کے

اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرے اور اُسی کی بندگی و اطاعت اختیار کرے۔ پس درحقیقت اللہ کا رسول اپنے بھیجے والے کی طرف سے ایک ایسے "اسٹیٹ" کا نظام لے کر آیا ہے جس میں نہ تو انسان کی خود اختیاری کے لیے کوئی جگہ ہے، نہ انسان پر انسان کی حاکمیت کے لیے کوئی مقام، بلکہ حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ جو کچھ بھی ہے صرف اللہ کے لیے ہے۔

پھر رسول کے بھیجے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اِس نظامِ اطاعت (دین) اور اُس قانونِ حیات (الھدیٰ) کو پوری جنس دین پر غالب کر دے۔ پوری جنسِ دین سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر جن جن صورتوں سے کسی کی اطاعت کر رہا ہے وہ سب "جنسِ دین" کی مختلف انواع ہیں۔ بیٹے کا والدین کی اطاعت کرنا، بیوی کا شوہر کی اطاعت کرنا، نوکر کا آقا کی اطاعت کرنا، ماتحت کا افسر کی اطاعت کرنا، رعیت کا حکومت کی اطاعت کرنا، پیروؤں کا پیشواؤں اور لیڈروں کی اطاعت کرنا، یہ اور ایسی ہی دوسری بے شمار اطاعتیں بحیثیت مجموعی ایک نظامِ اطاعت بناتی ہیں اور اللہ کی طرف سے رسول کے آنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ پورا نظامِ اطاعت اپنے تمام اجزا سمیت ایک بڑی اطاعت اور ایک بڑے قانون کے ماتحت ہو جائے، تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تابع ہوں، اُن سب کو منضبط (Regulate) کرنے والا ایک اللہ ہی کا قانون ہو، اور اُس بڑی اطاعت اور اُس ضابطۂ قانون کی حدود سے باہر کوئی اطاعت باقی نہ رہے۔

یہ رسول کا مشن ہے اور رسول اِس مشن کو پورا کرنے پر مامور ہے، خواہ شرک کرنے والے اُس پر کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں۔ شرک کرنے والے کون ہیں؟ وہ سب لوگ جو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری مستقل بالذات (یعنی خدا کی اطاعت سے آزاد) اطاعتیں شریک کرتے ہیں۔ جہاں تک اللہ کے قانونِ طبیعی (Law of nature) کا تعلق ہے، ہر انسان طوعاً و کرہاً اُسکی اطاعت کر رہا ہے کیونکہ اس اطاعت کے بغیر تو اُسکے لیے کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ مگر جہاں تک انسان کے دائرۂ

اختیار کا تعلق ہے، اس دائرے میں بعض انسان تو بالکل ہی غیر اللہ کے مطیع بن جاتے ہیں اور بعض انسان اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے کسی حصہ میں خدا کے بھیجے ہوئے قانونِ اخلاقی (شریعت) کی اطاعت کرتے ہیں اور کسی دوسرے حصہ میں اپنے نفس کی یا دوسروں کی اطاعت کرتے ہیں۔ اسی چیز کا نام اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری اطاعتوں کو شریک کرنا ہے، اور جو لوگ شرک کی ان مختلف صورتوں میں مبتلا ہیں، اُن کو یہ بات ناگوار ہوتی ہے کہ اپنی فطری اطاعت کی طرح اپنی اختیاری اطاعت و بندگی کو بھی بالکلیہ اللہ کے لیے خالص کر دیں۔ خواہ نادانی کے سبب سے، یا اخلاقی کمزوری کے سبب سے، بہر حال وہ شرک پر اصرار کرتے ہیں، لیکن اللہ کے رسول پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کی مزاحمت کے باوجود وہ اپنے مشن کو پورا کرے۔

۲- اسلامی نصب العین تک پہنچنے کا سیدھا راستہ

یہ ہے اسلامی نصب العین، اور اِس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے راہِ راست وہی ہے جو اللہ کے رسول نے اختیار کی، یعنی یہ کہ لوگوں کو "الھدیٰ" اور "دینِ حق" کی طرف دعوت دی جائے۔ پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر کے اپنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر دیں، دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ شریک کرنا چھوڑ دیں، اور خدا کے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنا لیں اُن کا ایک مضبوط جتھا بنایا جائے۔ پھر یہ جتھا تمام اُن اخلاقی، علمی اور مادی ذرائع سے جو اسکے امکان میں ہوں، دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے جہادِ کبیر کرے یہاں تک کہ اللہ کے سوا دوسری اطاعتیں جن جن طاقتوں کے بل پر قائم ہیں اُن سب کا زور ٹوٹ جائے اور پورے نظامِ اطاعت پر وہی الھدیٰ اور دینِ حق غالب ہو جائے۔

اِس راہِ راست کا ہر جزو قابلِ غور ہے:

پہلا جزو یہ ہے کہ انسانوں کو بالعموم اللہ کی حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے اور اسکے بھیجے ہوئے

قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے۔ یہ دعوت عام ہونی چاہیے۔ ہر وقت جاری رہنی چاہیے اور اسکے ساتھ دوسری غیر متعلق باتوں کی آمیزش نہ ہونی چاہیے۔ قوموں اور نسلوں اور ملکوں کے باہمی جھگڑے خود اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کی بحثیں، غیر الٰہی نظامات میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا، یا کسی ایسے نظام فاسد کی خود غرضانہ حمایت کرنا، یا کسی نظامِ فاسد میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرنا، یہ سب چیزیں نہ صرف یہ کہ الھدیٰ اور دینِ حق کی دعوت کے ساتھ میل نہیں کھاتیں بلکہ صریح طور پر اس کے منافی اور اسکے لیے مضرت رساں ہیں۔ پس جب کسی شخص یا گروہ کو دعوتِ حق کی خدمت انجام دینی ہو تو اسے اِن تمام جھگڑوں اور بحثوں سے الگ ہو جانا چاہیے اور اپنی دعوت کے ساتھ کسی دوسرے غیر متعلق اور بے جوڑ قضیے کو شامل نہ کرنا چاہیے۔

دوسرا جز یہ ہے کہ جتھا صرف اُن لوگوں کا بنایا جائے جو اس دعوت کو جان کر اور سمجھ کر قبول کریں، جو بندگی و اطاعت کو فی الواقع اللہ کے لیے خالص کر دیں، جو دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ واقعی شریک کرنا چھوڑ دیں اور حقیقت میں اللہ کے قانون کو اپنا قانونِ زندگی بنا لیں۔ رہے دوسرے لوگ جو اس طرزِ خیال یا اِس طرزِ زندگی کے محض معترف ہوں، یا اِس سے ہمدردی رکھتے ہوں، تو وہ مجاہدہ کرنے والے جتھے کے لیڈر کیا معنی، کارکن بھی نہیں بن سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ جو جس درجہ میں بھی اسکا ہمدرد یا بیرونی معاون بن جائے بسا غنیمت ہے، مگر ارکان اور ہمدردوں کے درمیان جو حقیقی فرق و امتیاز ہے اُسے کسی حال میں نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔

تیسرا جز یہ ہے کہ براہ راست غیر الٰہی نظام اطاعت پر حملہ کیا جائے، تمام کوششوں کا مقصود صرف اِس ایک بات کو بنایا جائے کہ اللہ کی حاکمیت قائم ہو، اور اسکے سوا کسی دوسری چیز کو مقصود بنا کر اسکے پیچھے قوتیں ضائع نہ کی جائیں۔

۳۔ مشکلات

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جتنی مستقل سیاسی جماعتیں ہیں، قریب قریب اُن سب کا

دعویٰ یہی ہے کہ ہمارا نصب العین اسلامی نصب العین ہی ہے، مگر ان سب نے اُس راہِ راست کو چھوڑ دیا ہے جسکی تشریح ابھی میں نے بیان کی ہے۔ وہ نہ تو "الھدیٰ" اور "دینِ حق" کی خالص، بے آمیز دعوتِ عام دیتی ہیں۔ نہ اُس پارٹی کی تشکیل کرتی ہیں جسکی قیادت و رکنیت صرف اُن لوگوں تک محدود ہو جو واقعی اپنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خاص کرتے ہوں۔ اور نہ وہ غیر متعلق مقاصد کو چھوڑ کر صرف اُس ایک مقصد کو اپنی کوششوں کا ہدف بناتی ہیں جس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ راہِ راست کے اِن تینوں اجزاء سے یہ سب جماعتیں منحرف ہو گئی ہیں۔

اس انحراف نے مختلف جماعتوں کے مسلک میں کیا کیا صورتیں اختیار کی ہیں؟ اسکی تفصیل میں بعد میں بیان کرونگا۔ پہلے میں اس انحراف کا سبب بتا دینا چاہتا ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اِن لوگوں کو اصل اسلامی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے میں تین بڑی زبردست مشکلات نظر آتی ہیں جنکا کوئی حل انکی سمجھ میں نہیں آتا۔

(۱) سب سے پہلی مشکل جو اِنکے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ الھدیٰ اور دینِ حق کی طرف دعوتِ عام کا نتیجہ خیز اور کامیاب ہونا موجودہ حالات میں انکو محال نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دوسری تحریکیں تو محض سیاسی، تمدنی اور معاشی مسائل کا حل پیش کرتی ہیں اور جن لوگوں کو اُنکا تجویز کردہ حل اپیل کرتا ہے وہ اپنا مذہب اور اپنی قومیت تبدیل کیے بغیر اُن تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مگر اسلام محض دنیوی مسائل کا حل ہی پیش نہیں کرتا بلکہ عقائد کا ایک نظام اور عبادات اور قوانین شرعیہ کا ایک ضابطہ بھی پیش کرتا ہے، اور اس تحریک میں شامل ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ لوگ اپنا مذہب اور اپنی قومیت تبدیل کر دیں۔ پھر یہ کیسے امید کی جاسکتی ہے کہ اسلام کی دعوتِ عام اُس طرح پھیل سکے گی جس طرح دوسری تحریکیں پھیلتی ہیں۔

(۲) دوسری مشکل جو اس راستہ میں انہیں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے خلاف لوگوں میں شدید تعصبات پھیلے ہوئے ہیں۔ انکا خیال یہ ہے کہ دوسری تحریکوں کا پھیلنا آسان ہے کیونکہ اُنکے خلاف تعصبات

موجود نہیں ہیں، مگر اسلام کا پھیلنا مشکل ہے کیونکہ اس کا نام سنتے ہی ماضی اور حال کے تعصبات کا ایک طوفان اُٹھ جاتا ہے۔

(۳) تیسری مشکل اُنکی نگاہ میں یہ ہے کہ کروڑوں مسلمانوں کی ایک قوم یہاں موجود ہے جو "قومیت" کے اعتبار سے تو "مسلمان" ہے، مگر اسکا اخلاقی مرتبہ اتنا بلند نہیں ہے کہ وہ اسلامی نصب العین کے لیے جدوجہد کر سکے۔ اِس قوم کو لے کر اُس راستہ پر چلنا چاہیں تو چل نہیں سکتے۔ اسکو چھوڑ کر چلنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور پھر یہ سوال بھی دماغ کو پریشان کرتا ہے کہ اگر تمام مقاصد کو نظر انداز کر کے صرف ایک الٰہی حکومت کے مقصد پر توجہات مرکوز کر دی جائیں تو آخر موجودہ سیاسی حالات اور آئندہ کے دستوری تغیرات میں "مسلمانوں" کے قومی مفاد کا کیا حشر ہوگا۔

۴۔ انحراف کی راہیں

یہی تین مشکلات ہیں جنکو اس راہ میں حائل دیکھ کر لوگ دائیں اور بائیں رخ پر راستہ کترا کر نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جزئیات کے اعتبار سے مختلف لوگوں کے نظریات اور عملی طریقوں میں جو اختلافات ہیں انکو نظر انداز کر کے بڑی اور اصولی تقسیم اگر کی جائے تو یہ سب تین گروہوں میں منقسم ہو جاتے ہیں:

ایک وہ گروہ جو کہتا ہے کہ پہلے ہمیں ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کے ساتھ موافقت کر کے اس ملک کو انگریزی اقتدار سے آزاد کرا لینا چاہیے تاکہ یہاں ایک مشترک جمہوری اسٹیٹ قائم ہو جائے۔ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد ہم بتدریج اُس اسٹیٹ کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کرنے کے لیے کوشش کرینگے۔

دوسرا وہ گروہ جس کا خیال یہ ہے کہ پہلے انگریزی اقتدار کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ہمیں مستقل ہندو اکثریت کے تسلط کا سدِباب کرنا چاہیے، اور ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اس ملک میں ایک

جمہوری اسٹیٹ کے بجائے دو اسٹیٹ قائم ہوں، ایک وہ اسٹیٹ جس میں مسلم اکثریت کی وجہ سے اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے اور دوسرا وہ اسٹیٹ جس میں ہندو اکثریت کی وجہ سے اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ میں جائے مگر زیادہ سے زیادہ جو آئینی تحفظات ممکن ہیں اُنکے ذریعہ سے مسلمانوں کی پوزیشن محفوظ ہو جائے۔ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد ہم مسلم اکثریت والے اسٹیٹ کو بتدریج اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کرینگے اور پھر ہندو اکثریت والے اسٹیٹ میں تغیر و اصلاح کی کوشش کرینگے۔

تیسرا وہ گروہ جو موجودہ حالات میں دعوتِ عام اور ایک انقلابی پارٹی کی تشکیل کو آسان بنانے کے لیے اسلام کو ایک دوسرے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے تاکہ وہ اُن لوگوں کے لیے قابلِ قبول ہو جائے جو اسلامی عقائد اور عبادات اور نظامِ شریعت کی بندشوں سے گھبراتے ہیں۔ اس گروہ نے اگرچہ ابھی کوئی مستقل جماعتی صورت نہیں اختیار کی ہے، مگر مجھے معلوم ہے کہ اس طرزِ خیال کے لوگ ایک اچھی خاصی تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں اور انکی تجویزیں اس وقت حالتِ جنینی (Embryonic stage) سے گذر رہی ہیں۔

۵۔ منحرف راستوں کی غلطی

اب میں ان میں سے ایک ایک گروہ کے طریقہ پر الگ الگ تنقید کر کے بتاؤنگا کہ ان طریقوں میں غلطی کیا ہے، اِن میں سے ہر ایک نے اسلام کی راہِ راست سے کس طرح انحراف کیا ہے، اور ان پھیر کے راستوں سے اصل اسلامی نصب العین تک پہنچنا ابداً غیر ممکن الوقوع کیوں ہے۔

"آزادیِ ہند" کو مقدم رکھنے والے | پہلا گروہ زیادہ تر علماء اور مذہبی خیالات کے لوگوں پر مشتمل ہے اور بالعموم اِس گروہ کے لوگ دوسرے گروہ کی بہ نسبت زیادہ مذہبی ہیں۔ اسی وجہ سے اِن کے انحراف پر مجھ کو سب سے زیادہ افسوس ہے۔ اِن حضرات نے مذکورہ بالا مشکلات سے خوف زدہ ہو کر یہ خیال قائم کر لیا کہ موجودہ حالات میں اصل اسلامی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی نہیں کی جاسکتی اس لیے

انہوں نے اپنی کوششوں کا مقصود یہ ٹھیرا لیا کہ ہندوستان انگریزی اقتدار سے آزاد ہو جائے۔ مقصود بدل جانے سے لامحالہ راستہ بھی بدل گیا۔ اسلام کی راہِ راست کے تین اجزا جو میں نے ابتدا میں بیان کیے ہیں، ان کا راستہ ہر جزو میں اس سے مختلف ہے:

(۱) دعوت کے باب میں اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کی حاکمیت و اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنے کی طرف بلایا جائے۔ مگر یہ ہندوستان کے باشندوں کو اس طرف بلاتے ہیں کہ تم خود مالک الملک بنو۔ یہ غیر الٰہی اقتدارِ اعلیٰ کی نفی نہیں کرتے بلکہ صرف انگریزی اقتدار اعلیٰ کی نفی کرتے ہیں۔ اور یہ الٰہی اقتدار اعلیٰ کا اثبات بھی نہیں کرتے بلکہ اسکی جگہ باشندگانِ ملک کی خود اختیاری اور جمہوری اقتدار اعلیٰ کا اثبات کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شرک ہونے کی حیثیت سے انگریزی اقتدار اعلیٰ اور جمہوری اقتدار اعلیٰ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کی دعوت سراسر غیر اسلامی بلکہ مخالفِ اسلام دعوت ہے۔

انکے نزدیک انگریزی اقتدار کے مقابلہ میں جمہور اہل ہند کا اختیار، اور انگریزی شریعت کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کی قانون سازی قابل ترجیح ہے، حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے دونوں یکساں بغاوت، یکساں کفر اور یکساں طغیان و معصیت ہیں۔

پھر یہ انگریز اور ہندوستانی کے درمیان قومی و وطنی عداوت و تعصب کی آگ بھڑکانے میں حصہ لیتے ہیں، حالانکہ اسلام کی دعوتِ عام کے راستہ میں یہ رکاوٹ ہے۔ اسلام کی نگاہ میں انگریز اور ہندوستانی دونوں انسان ہیں۔ وہ دونوں کو یکساں اپنی دعوت کا مخاطب بناتا ہے۔ اس کا جھگڑا انگریز سے اس بات پر نہیں ہے کہ وہ ایک ملک کا باشندہ ہو کر دوسرے ملک پر حکومت کیوں کرتا ہے۔ بلکہ اس بات پر ہے کہ وہ خدا کی حاکمیت اور اس کے قانون کی اطاعت کیوں تسلیم نہیں کرتا۔ بعینہٖ اسی بات پر اس کا جھگڑا ہندوستانی سے بھی ہے۔ وہ دونوں کو ایک ہی بات کی طرف بلاتا ہے۔ ایک کا حامی بن کر دوسرے سے لڑنا اس کی حیثیت کے منافی ہے کیونکہ اگر وہ ہندوستانی اور انگریز کے وطنی و قومی جھگڑے میں

ایک کا طرف دار اور دوسرے کا مخالف بن جائے[1] تو انگریز کے دل کا دروازہ اُس کی دعوت کے لیے بند ہو جائیگا۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ ایک طرف اسلام کے داعی بنتے ہیں اور دوسری طرف اِس وطنی و قومی جھگڑے میں فریق بھی بنتے ہیں وہ دراصل اسلام کے مفاد کو ہندوستانیت کے مفاد پر قربان کرتے ہیں۔

اِن تمام بنیادی غلطیوں کے ساتھ یہ حضرات کبھی کبھی اسلام کی تبلیغ بھی فرمایا کرتے ہیں۔ مگر ایسی تبلیغ کبھی مُوثر نہیں ہوسکتی۔ ایک ساز سے دو بالکل مختلف آوازیں سُن کر اور ایک زبان سے دو قطعی متضاد باتیں سماعت کر کے آخر کون متاثر ہوسکتا ہے؟

(۲) تشکیل جماعت کے باب میں یہ حضرات اس سے بھی زیادہ مختلط ہیں۔ اول تو دعوت کی نوعیت بدل جانے کی وجہ سے خود ہی جماعت کی ترکیب اور اجزائے ترکیبی کے متعلق انکا نقطۂ نظر بدل گیا ہے۔ دوسرے "مسلمان قوم" کے تخیل نے پریشان خیالی کے لیے ایک اور وجہ بھی پیدا کر دی ہے۔ اِن اسباب سے یہ ہر قسم رطب و یابس آدمی اکٹھے کر لیتے ہیں، اور اُن آدمیوں کے اقوال و افعال میں بیک وقت بیسیوں قسم کی متضاد باتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ایک متحد المزاج نظریہ کی حمایت کے لیے آپ اٹھیں تو لامحالہ آپ اپنی پارٹی کے لیے انہی آدمیوں کا انتخاب کرینگے جو یکسوئی کے ساتھ اُس خاص نظریہ کے متبع ہوں بخلاف اسکے ایک مخلوط اور غیر معین مزاج رکھنے والے نظریہ کو لے کر جب آپ اٹھینگے تو آپ کا معیار انتخاب اکثر اُن قیود سے آزاد ہو جائیگا جو متحد المزاج نظریہ کے لیے ناگزیر ہیں۔ ابھی چند روز ہوئے مجھے ایک مجلس

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر ایک قوم دوسری قوم پر ظلم کرے یا اسکے حقوق تلف کرے تو اسلام مظلوم قوم کی حمایت نہ کریگا۔ بلکہ درحقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ قومیت اور وطنیت کی بنیاد پر دونوں قوموں میں جو نزاع ہوگی، اسلام اس میں کوئی حصہ نہ لیگا۔ وہ ظالم کو ملامت کریگا، نہ اس لیے کہ وہ فلاں قوم کا آدمی ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ ظالم ہے۔ اور اسی طرح وہ مظلوم کی حمایت بھی اس حیثیت سے نہ کریگا کہ وہ فلاں قوم سے تعلق رکھتا ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ مظلوم ہے۔

میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا جہاں ہندوستان کی ایک بہت بڑی ذمہ دار جمعیت کی مقامی شاخ کو منظم کرنے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کی بحث و تمحیص کے بعد جو بات قرار پائی وہ یہ تھی کہ رکنیت کے فارم طبع کرا لیے جائیں اور پندرہ دن کے اندر زیادہ سے زیادہ ممبر بھرتی کر کے ارکان کا ایک جلسہ عام کر دیا جائے جس میں عہدہ داروں کا انتخاب ہو جائے۔ لیجیے، بس جمعیت کی مقامی شاخ منظم ہو گئی۔ اس طرح بھانت بھانت کے آدمی محض رکنیت کے فارموں پر دستخط کر کے اور ۴ر سالانہ فیس ادا کر کے ان جماعتوں میں داخل ہو جاتے ہیں، پھر انہی آدمیوں کے ووٹوں سے منتخب ہو کر وہ لوگ برسرِ کار آتے ہیں جنکا کام رہنمائی و سربراہ کاری ہوتا ہے، اور ایسے ہی لوگوں کی متفقہ خواہشات سے پالیسیاں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ کیا کوئی شخص توقع کر سکتا ہے کہ جماعتی تشکیل کے اس طریقے سے کبھی اسلامی نصب العین کی طرف بھی کوئی پیش قدمی کی جا سکتی ہے؟

(۳) اسی طرح تیسرے جزء میں بھی اِنکا طریقہ اسلام کی راہ راست سے ہٹا ہوا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا اسلام براہِ راست غیر اسلامی نظام اطاعت پر حملہ کرتا ہے اور اُسکا تقاضہ یہ ہے کہ تمام مساعی کو حاکمیتِ رب العالمین کے قیام و اثبات پر مرکوز کر دیا جائے۔ لیکن اسکے برعکس یہ لوگ اپنی سعی و جہد کا رُخ برطانوی نظام اطاعت کی تخریب اور حاکمیتِ عوام کے قیام کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ یہ صریح انحراف ہے صراطِ مستقیم سے۔ اس انحراف پر جب اعتراض کیا جاتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ برطانوی نظام اطاعت اسلامی نصب العین کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے، ہم تنہا اس رکاوٹ کو دور نہیں کر سکتے، اسلیے پہلے دوسروں کی مدد سے اس کو دور کر لیں، پھر اصل منزل مقصود کی طرف بڑھنے کے لیے راستہ آسان ہو جائیگا۔ مگر میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ راستہ آسان کیسے ہو جائیگا۔ ظاہر بات ہے کہ ایک نظام اطاعت یا دین کو ہٹا کر اُسکی جگہ دوسرا نظام اطاعت یا دین کبھی قائم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ نفوسِ انسانی میں پہلے نظام کی تخریب اور دوسرے نظام کی تعمیر کا خیال اور ارادہ کمال درجہ قوت کے ساتھ مستحکم نہ کر دیا جائے۔ اگر ہندوستان کے موجودہ انگریزی نظام اطاعت کی جگہ آپ جمہوری نظام اطاعت قائم کرنا چاہیں تو یہ انقلاب صرف

اسی طرح ممکن ہے کہ آپ باشندگانِ ہند کے دلوں میں حاکمیتِ انگریز کے بجائے خود اپنی حاکمیت کے برحق ہونے کا تخیل اور عملاً مالک الملک بن جانے کا عزم پوری شدت کے ساتھ پیدا کر دیں۔ برعکس اس کے اگر آپ ہندوستان میں الٰہی نظامِ اطاعت قائم کرنا چاہیں تو یہ انقلاب بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ عوام الناس کو خود اپنی حاکمیت کے دعوے سے دست بردار ہونے اور ہر غیر اللہ کی حاکمیت کا انکار کرنے پر آمادہ کریں اور اللہ کے مالک الملک ہونے کا عقیدہ اُنکے دلوں میں اتنی قوت کے ساتھ بٹھائیں کہ وہ اُسکی حاکمیت کے آگے برضا و رغبت سر جھکا دیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کا آخری مقصد الٰہی نظامِ اطاعت کا قیام ہے وہ کس طرح بحالت ہوش و حواس اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے ذریعہ کے طور پر یہ تدبیر اختیار کر سکتے ہیں کہ عوام الناس کے دل میں خود اپنی حاکمیت کا عقیدہ اور ارادہ اتنی قوت کے ساتھ بٹھا دیں کہ اسکے زور سے دینِ انگریز کی مضبوط جمی ہوئی جڑیں اکھڑ جائیں اور دینِ جمہور کی جڑیں زمین میں جگہ پکڑ لیں؟ جہاں عامۂ خلائق کے دلوں میں اپنی حاکمیت کا عقیدہ اور عزم اتنی قوت کے ساتھ جم گیا ہو کیا وہاں لوگوں کو خداوندِ عالم کے آگے اپنی حاکمیت سے دست بردار ہونے پر آمادہ کرنا موجودہ انگریزی حاکمیت کی جڑیں اکھاڑنے سے کچھ کم مشکل ہے؟ کیا امریکہ، جاپان، جرمنی اور انگلستان جیسے اصطلاحاً "آزاد" ممالک میں حکومتِ الٰہی کا قیام اس سے کچھ کم دشوار ہے جتنا ہندوستان جیسے اصطلاحاً "غلام" ملک میں دشوار نظر آتا ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی ہی میں دیا جا سکتا ہے، تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ برطانوی اقتدار کی جگہ ہندوستانی اقتدار کا قیام آخر کس معنی میں حکومتِ الٰہی کے قیام کی طرف ایک گونہ پیش قدمی ہے۔

تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ تدبیر عملاً کارگر ہو سکتی ہے تب بھی میں اسکے صحیح ہونے سے انکار کرتا ہوں — لازم نہیں کہ ہر تدبیر جو کارگر ہو وہ صحیح بھی ہو — دراصل یہ ایک سخت ناپاک تدبیر ہے جسے اختیار کرنے کا خیال بھی ایک مسلمان دل میں نہیں لا سکتا۔ جو شخص درحقیقت پوری سچائی کے ساتھ اللہ کے مالک الملک ہونے پر ایمان رکھتا ہو وہ آخر کس دل سے یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اپنے ایمان

کے خلاف عوام الناس میں اِس عقیدہ کی تبلیغ کرے کہ تم خود مالک الملک ہو؟ جس شخص کا اعتقاد یہ ہو کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی صرف حدود اللہ کی پابند ہونی چاہیے اور حکومت وہ ہونی چاہیے جو اللہ کے سامنے جوابدہ ہو وہ کیونکر اپنی کوششوں کا مقصود یہ قرار دے سکتا ہے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی پر حدود جمہور کا تسلط قائم ہو اور حکومت جمہور کے سامنے جوابدہ ہو؟ کس طرح ایک سچے آدمی کی زبان ایسے عقیدے کی اشاعت یا حمایت میں کھل سکتی ہے جسکو وہ فی الواقع باطل سمجھتا ہے، اور کس طرح وہ اُس چیز کے قیام کی راہ میں جان و مال سے جہاد کر سکتا ہے جو اس کے اعتقاد میں حق نہیں بلکہ طاغوت ہے؟

یہ جو کچھ میں نے عرض کیا، یہ تو محض اس امر کا ثبوت ہے کہ ان لوگوں کا راستہ اسلام کی راہِ راست سے منحرف ہے۔ رہی یہ بات کہ اِس پھیر کے راستہ سے یہ لوگ کبھی اسلام کے نصب العین تک نہیں پہنچ سکتے، تو اس دعوے پر میرے پاس یہ دلیل ہے کہ جن مشکلات سے خوف زدہ ہو کر انہوں نے یہ پھیر کی راہ اختیار کی ہے وہ ہندوستان کے انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے بعد بھی جوں کی توں قائم رہینگی۔ اوپر میں نے مشکلات کی جو تشریح کی ہے اس پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈال کر دیکھ لیجیے۔ کیا ان میں سے کوئی مشکل بھی خود مختار ہندوستان کے دور میں دُور ہو جائیگی؟ اگر نہیں تو جو لوگ آج ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کی حکمت اور ہمت نہ رکھنے کی وجہ سے راستہ کترا کر نکل رہے ہیں وہ کل بھی اسی وجہ سے اصل مقصد اسلامی کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے سے جی چرائینگے۔ خوب جان لیجیے کہ اس مقصد کی طرف جب بھی آپ اقدام کرنا چاہینگے، بہر حال آپکو ان مشکلات سے سابقہ پیش آئیگا۔ جو لوگ اِن کا مقابلہ کرنے کی تدبیر اور عزم نہیں رکھتے وہ موجودہ حالات ہی میں نہیں بلکہ کسی حال میں بھی اس طرف اقدام نہیں کر سکتے۔ اور جنکے پاس تدبیر اور عزم دونوں موجود ہیں، اُن کے لیے کسی پھیر کے راستہ پر چلنا تضیع وقت اور حماقت ہے، وہ تو اس پہاڑ کو کاٹ کر براہِ راست ہی اپنے مقصد کی طرف قدم بڑھائینگے۔

پاکستانی خیال کے لوگ دوسرا گروہ زیادہ تر اُس طبقہ پر مشتمل ہے جس نے تمام تر مغربی طرز پر ذہنی تربیت پائی ہے۔ یہ لوگ سیاسی فکر تو مغربی آخذ سے لیتے ہیں، مگر چونکہ موروثی طور پر اسلام کے حق میں ایک تعصب اِن کے اندر موجود ہے، اور "مسلمان قوم" ہونے کا شعور اِن کے اندر بیدار ہو گیا ہے اسلیے جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں "مسلمان قوم" کے لیے اسلام کے نام ہی سے کرنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اِنکے اقوال اور اعمال میں اسلامی اصطلاحات اور مغربی طرز فکر و عمل عجیب طریقہ سے خلط ملط ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس مضمون میں یہ موقع نہیں ہے کہ میں اس خلط مبحث کا تجزیہ کر کے تفصیل کے ساتھ اس مخلوطہ کے ایک ایک جز کی اصل و نوعیت کا نشان دے سکوں۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پہلے گروہ کی طرح اس گروہ کا راستہ بھی راہِ راست کے تینوں اجزا سے منحرف ہے۔

(۱) پہلے دعوت کو لیجیے۔ اِنکے ذمہ دار لیڈروں کی تقریریں، اِنکی نمائندہ مجلسوں کی قراردادیں، اِنکے کارکنوں کی باتیں، اِنکے اہلِ قلم کی تحریریں، سب کی سب اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ اِنکی دعوت اصل میں ایک قوم پرستانہ دعوت ہے، یعنی اِنکی پکار اسلام کے نصب العین کی طرف نہیں ہے بلکہ اس طرف ہے کہ اِن کی قوم متفق و متحد ہو کر ہندو قوم کے مقابلہ میں اپنے دنیوی مفاد کی حفاظت کرے۔ گویا جس طرح آزادی پسند لوگوں نے انگریزوں کو اپنا قومی حریف بنایا ہے اُسی طرح اِنہوں نے ہندوؤں کو اپنا قومی حریف بنا لیا ہے۔ اِس لحاظ سے یہ اور "آزادی پسند" حضرات ایک سطح پر کھڑے ہیں۔ لیکن جس چیز نے اُنکی بہ نسبت اِنکی روش کو اسلام کے لیے اور زیادہ مُضر بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ تو وطن اور وطنی مفاد کے نام پر لڑتے ہیں، مگر یہ اپنی قومی اور دنیوی لڑائی میں بار بار اسلام اور مسلمان کا نام لیتے ہیں جسکی وجہ سے اسلام خواہ مخواہ ایک فریق جنگ بن کر رہ گیا ہے اور غیر مسلم قومیں اُس کو اپنا سیاسی اور معاشی حریف سمجھنے لگی ہیں۔ اِس طرح اِنہوں نے نہ صرف اپنے آپ کو اسلام کی دعوت کے لائق نہیں رکھا ہے، بلکہ اسلام کی اشاعت کے راستہ میں اتنی بڑی رکاوٹ پیدا کر دی ہے کہ اگر دوسرے مسلمان بھی یہ کام کرنا چاہیں

تو غیر مسلموں کے دلوں کو اسلام کے لیے مقفل پائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قوم پرستانہ دعوت کے ساتھ یہ لوگ کبھی کبھی اسلام کی خوبیاں اور اسکے اصولوں کی فضیلت بھی بیان کیا کرتے ہیں۔ مگر اول تو قوم پرستی کے پس منظر میں یہ چیز ایک اصلی دعوت کے بجائے محض ایک قومی تفاخر بن کر رہ جاتی ہے۔ اور مزید براں دعوت اسلام کے ساتھ جن دوسری باطل چیزوں کی یہ آمیزش کرتے ہیں وہ بالکل اس دعوت کی ضد ہیں۔ ایک طرف اسلامی نظام حکومت کی تبلیغ اور دوسری طرف اُن "مسلمان" ریاستوں اور حکومتوں کی حمایت جنکا نظام بالکل غیر اسلامی ہے، ایک طرف اسلامی نظام معاشی کی تشریح اور دوسری طرف خود اپنی قوم کے قارونوں کی تائید و مدافعت، ایک طرف انسانی قانون سازی کا اصولی ابطال اور دوسری طرف خود قانون ساز مجلسوں میں اپنے حصہ کا مطالبہ، ایک طرف حاکمیت رب العالمین کا اقرار و اثبات اور دوسری طرف حاکمیت جمہور کے اصول پر خود اپنی قومی حکومت کے قیام کی فکر، ایک طرف انسانیت کی نسلی، قومی اور وطنی تقسیم کا ابطال اور دوسری طرف ہر وقت قوم قوم کا شور اور خود قومیت ہی کے اصول پر دوسری قوموں سے جدال و کشمکش، ایک طرف بے غرضانہ حق پرستی کا دعویٰ اور دوسری طرف شب و روز اپنے دنیوی مفاد ہی کا نوحہ و ماتم، ایک طرف اسلامی تہذیب و تمدن پر فخر و ناز اور اسکی حفاظت کے لیے پُرشور لام بندی اور دوسری طرف اسی تہذیب و تمدن کے باغیوں اور قاتلوں کی سرداری و پیشوائی، یہ دونوں چیزیں آخر کس طرح ایک ساتھ نبھ سکتی ہیں؟ منکرِ مے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن۔ ایسی متضاد باتوں سے دنیا نے کب کوئی اثر قبول کیا ہے کہ آج اِن سے اسلام کا جھنڈا زمین میں گڑ جانے کی امید کی جاتی ہے۔

(۲) اب دیکھیے کہ یہ اپنی جماعتی تشکیل کس ڈھنگ پر کرتے ہیں۔ اِنکا قاعدہ یہ ہے کہ یہ اُن سب لوگوں کو جو ازروئے پیدائش مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں، اپنی جماعت کی رکنیت کا بُلاوا دیتے ہیں اور جو اُس کو قبول کرلے اسے ابتدائی رکن بنا لیتے ہیں۔ پھر انہی ابتدائی ارکان کے ووٹوں سے ذمہ دار

کارکن اور عہدہ دار منتخب ہوتے ہیں اور انہی کی کثرت رائے سے تمام معاملات انجام دیئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ صرف قومی تنظیم ہی کے لیے موزوں ہو سکتا ہے اور اس طریقہ سے جو نظام بنے وہ اسکے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ ایک قوم کی خواہشات جیسی کچھ بھی ہوں اُنکے حصول کی کوشش کرے۔ رہی ایک اصولی تحریک، تو اسکو چلانے کے لیے یہ طریق جماعت سازی نہ صرف بیکار بلکہ مُضر ہے۔ ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ اُنکے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا اسلامی اصول ہی پر ہوگا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ یہ انبوہِ عظیم جسکو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اسکے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں، نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے اسلیے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے، نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ اِنکی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستہ پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔

(۳) اسکے بعد اُس طریقہ کا جائزہ لیجیے جس سے یہ بزعم خود اسلامی نصب العین تک پہنچنے کی امید رکھتے ہیں۔ اِنکی تجویز یہ ہے کہ پہلے اُسی جمہوری دستور کے مطابق، جو انگریزی حکومت یہاں نافذ کرنا چاہتی ہے، مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم ہو جائے، پھر کوشش کی جائیگی کہ یہ قومی حکومت اسلامی نظام حکومت میں بتدریج تبدیل ہو جائے[1]۔ لیکن یہ ویسی ہی غلطی ہے جیسی

[1] اس تجویز پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔ برعکس اسکے انکی طرف سے بصراحت اور بتکرار جس چیز کا اظہار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انکے پیش نظر محض ایک ایسی جمہوری حکومت ہے جس میں دوسری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ ہو)

"آزادیٔ ہند" کو مقدم رکھنے والے حضرات کر رہے ہیں۔ اُنکی تجویز پر مجھے جو اعتراضات ہیں بعینہٖ وہی اعتراضات اُنکی تجویز پر بھی ہیں۔ اُنکا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں حاکمیتِ جمہور کے اصول پر خود مختار حکومت کا قیام آخر کار حاکمیت رب العالمین کے قیام میں مددگار ہو سکتا ہے۔ جیسی مسلم اکثریت اِس مجوزہ پاکستان میں ہے، ویسی ہی، بلکہ عددی حیثیت سے بہت زیادہ زبردست اکثریت افغانستان، ایران، عراق، ٹرکی اور مصر میں موجود ہے اور وہاں اُسکو وہ "پاکستان" حاصل ہے جسکا یہاں مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ پھر کیا وہاں مسلمانوں کی خود مختار حکومت کسی درجہ میں بھی حکومت الٰہی کے قیام میں مددگار ہے یا ہوتی نظر آتی ہے؟ مددگار ہونا تو درکنار، میں پوچھتا ہوں کیا آپ وہاں حکومت الٰہی کی تبلیغ کر کے پھانسی یا جلا وطنی سے کم کوئی سزا پانے کی امید کر سکتے ہیں؟ اگر آپ وہاں کے حالات سے کچھ بھی واقف ہیں تو آپ اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کی جرأت نہ کر سکینگے۔ اور جب صورت حال یہ ہے تو آپ کو غور کرنا چاہیے کہ آخر اسلامی انقلاب کے راستہ میں مسلمان قوموں کی یہ آزاد حکومتیں کے سدِّ راہ ہونے کا سبب کیا ہے۔ اس معاملہ کی جتنی تحقیق آپ کرینگے جواب اسکے سوا کچھ نہ پائینگے کہ دراصل اصطلاحاً و نسلاً مسلمان ہونا اور چیز ہے اور نظریۂ حیات و مقصدِ زندگی کا اسلامی ہونا بالکل ایک دوسری چیز۔ جو لوگ

بقیہ حاشیہ صـ۲۷ و۔ غیر مسلم قومیں بھی حصہ دار رہیں مگر اکثریت کے حق کی بنا پر مسلمانوں کا حصہ غالب ہو۔ بالفاظ دیگر انکو مطمئن کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہندو اکثریت کے تسلط سے وہ صوبے آزاد ہو جائیں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے، باقی رہا نظام حکومت تو وہ "پاکستان" میں بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ہندوستان میں ہوگا۔ ان کے اس نصب العین پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کی کافرانہ حکومت کے مقابلہ میں کچھ بھی قابلِ ترجیح نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت ہے، تو ذمہ دار لیڈروں میں سے تو کسی نے اس کا جواب نہ دیا، البتہ جو لوگ پاکستانی حلقوں کی صفِ آخر میں شمار ہوتے ہیں اور جنکی کوئی ذمہ دار حیثیت نہیں ہے انہوں نے کہنا شروع کیا کہ مسلم اکثریت کو جب خود اختیاری حاصل ہو جائیگی تب ہم نظامِ حکومت کو بدلنے کی کوشش کرینگے۔

روح و اخلاق کے اعتبار مسلم نہ ہوں بلکہ محض اصطلاحی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہوں اُنکو اگر بیرونی اثر و اقتدار سے کامل آزادی نصیب بھی ہو جائے، اور اگر اُنکے جمہور کو خود اپنی پسند کے مطابق نظام حکومت قائم کرنے کا پورا اختیار بھی حاصل ہو، تب بھی حکومتِ الٰہی وجود میں نہیں آسکتی۔ وہ اپنے دنیوی مفاد کے پرستار ہوتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان میں حق اور صداقت کے لیے اپنے مفاد کو قربان کرنے کی طاقت نہیں ہوتی، بلکہ اسکے برعکس جب کبھی اُنکی اغراض دنیوی سے حق و صداقت کا تصادم ہوتا ہے تو وہ حق کو چھوڑ کر ہمیشہ اُس طرف جاتے ہیں جدھر اُنکی اغراض پوری ہوتی ہیں۔ جہاں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو وہاں کبھی یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ عام انتخاب میں اُنکے ووٹوں سے وہ صالحین منتخب ہونگے جو منہاج نبوت پر حکومت کرنے والے ہوں۔ جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا، قدرتی بات ہے، کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا۔ اسی طرح اگر سوسائٹی بگڑی ہوئی ہو تو اس کے ووٹوں سے وہی لوگ منتخب ہو کر برسرِ اقتدار آئینگے جو اس سوسائٹی کی خواہشات نفس سے سندِ قبولیت حاصل کر سکینگے۔ پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائیگی، اُن کا گمان غلط ہے۔ دراصل اسکے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومتِ الٰہی رکھنا اِس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عوام کی اخلاقی و ذہنی تربیت کرکے، اُنکے نقطۂ نظر کو تبدیل کرکے، اور اُنکے نفسیات میں انقلاب برپا کرکے ایک جمہوری نظام کو الٰہی حکومت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس اخلاقی و نفسیاتی انقلاب کے برپا کرنے میں کیا مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کچھ بھی مددگار ہوگی؟ کیا وہ لوگ جو موجودہ بگڑی ہوئی سوسائٹی کے مادّی مفاد سے اپیل کرکے اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہونگے ان سے آپ امید کر سکتے ہیں کہ وہ حکومت کا روپیہ، اسکے وسائل، اُسکے اختیارات کسی ایسی تحریک کی اعانت میں صرف کرینگے جسکا مقصد عوام کی ذہنیت تبدیل کرنا اور انہیں حکومت

الٰہی کے لیے تیار کرنا ہو؟ اِس کا جواب عقل اور تجربہ دونوں کی روشنی میں نفی کے سوا کچھ نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ لوگ اِس انقلاب میں مدد دینے کے بجائے الٹی اسکی مزاحمت کرینگے کیونکہ وہ خوب جانتے ہونگے کہ اگر عوام کے نفسیات میں تغیر واقع ہوگیا تو اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں انکا چراغ نہ جل سکے گا۔ یہی نہیں، اس سے زیادہ خوفناک حقیقت یہ ہے کہ نام کے مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کفار کی بہ نسبت بہت زیادہ جسارت و بے باکی کے ساتھ ایسی ہر کوشش کو کچلیں گے اور اُنکے نام اُنکے ظلم کی پردہ پوشی کے لیے کافی ہونگے۔ جب صورتِ معاملہ یہ ہے تو کیا وہ شخص نادان نہیں ہے جو اسلامی انقلاب کا نصب العین سامنے رکھ کر ایسی جمہوری حکومت کے قیام کی کوشش کرے جو ہر کافرانہ حکومت سے بڑھ چڑھ کر اُسکے مقصد کی راہ میں حائل ہوگی؟

تحریف دین کے مجوزین اب تیسرے گروہ کو لیجیے۔ یہ لوگ مختلف قسم کی تجویزیں سوچ رہے ہیں۔ کوئی فکر اسلامی کے ساتھ غیر اسلامی افکار کا جوڑ لگا کر ایک نئی "خوشگوار" معجون بنانا چاہتا ہے۔ کوئی اس خیال میں ہے کہ "ہندوستانی اسلام" کا ایک نیا ایڈیشن نکالے۔ کوئی یہ چاہتا ہے کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے محض اسکے سیاسی معاشی اصولوں کو لے لیا جائے اور انکی بنیاد پر ایک ایسی جماعت بنائی جائے جس میں شامل ہونے کے لیے عقائد، عبادات اور احکام شرعیہ کی پابندی لازم نہ ہو۔ یہ سب لوگ اپنے نزدیک نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان طریقوں سے رفتہ رفتہ وہ تنفر دور ہو جائیگا جو اسلام کے خلاف طبیعتوں میں پیدا ہوگیا ہے، اور جب بعض اسلام سے کسی حد تک مانوس ہو جائینگے تو پورے اسلام سے مانوس ہونے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔

لیکن یہ سب خیالاتِ خام ہیں۔ نہ اصولی حیثیت سے اِنکو صحیح کہا جاسکتا ہے اور نہ عملی حیثیت سے ہی اِن کی کوئی قدر و قیمت ہے۔ میرے نزدیک ایسی تمام تجویزیں ضعفِ دل اور ضعفِ دماغ کا نتیجہ ہیں۔

اصولی حیثیت سے درحقیقت ہم اسلام میں کسی رد و بدل، کسی کمی و بیشی، اور کسی ترمیم و تشکیلِ جدید کے

مجاز ہی نہیں ہیں۔ ہم اسلام کے مالک نہیں ہیں، اُسکے صانع نہیں ہیں، اُسکے شارع نہیں ہیں۔ اسلام ہمارا مال نہیں ہے کہ مارکیٹ میں جیسی طلب ہو اسکے مطابق اپنے اس مال کو بنا کر بازار میں لائیں۔ ہماری حیثیت صرف پیرو اور مبلغ کی ہے۔ مالک نے عقائد، عبادات اور احکام کا یہ پورا مجموعہ ہمیں دیا ہے تاکہ ہم خود اسکی پیروی کریں اور دوسروں تک اسے پہنچائیں۔ اس مجموعہ میں کوئی ترمیم کرنے کا، یا اسکی اصلی صورت کو بدل کر اسکی کوئی اور صورت بنانے کا ہم کو ہرگز کوئی حق نہیں پہنچتا۔ جسکو لینا ہے اسے پورے مجموعہ کو لینا پڑیگا اور اسی صورت میں لینا ہوگا جس میں مالک نے اُسے دیا ہے۔ اور جو اسکو اس ہیئت مجموعی اور اس مقرر صورت کے ساتھ نہ لینا چاہے اسکی خوشامد کرنے اور اسے کم و بیش پر راضی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اسلام تو ایک حکم ہے خالق کی طرف سے مخلوق کی طرف۔ خالق کا کام مخلوق کی خوشامد کرنا اور اسکو راضی کرنا نہیں ہے۔ مخلوق کو یا تو اس کا حکم، جیسا کہ وہ ہے، جوں کا توں ماننا پڑیگا۔ ورنہ وہ خود اپنا ہی کچھ بگاڑیگی، خالق کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گی۔ اسی لیے اللہ کی طرف سے اسکے جو رسول دنیا میں آئے انہوں نے پورے حکم کو لوگوں کے سامنے بعینہٖ پیش کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ چاہو اسکو لو اور چاہو رد کر دو، بہرحال تمہاری خواہشات کے مطابق اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا جائیگا۔ ٹھیک یہی پوزیشن رسولوں کے نائب ہونے کی حیثیت سے ہماری بھی ہے۔

پھر یہ کتنی غیر معقول تجویز ہے کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے محض اسکے معاشی و سیاسی اصولوں کو لے لیا جائے اور انہی کی بنیاد پر ایک پارٹی ایسی بنائی جائے جس میں شامل ہونے کے لیے توحید، آخرت، قرآن، رسالت، کسی چیز پر بھی ایمان لانے کی ضرورت نہ ہو اور نہ عبادات کی بجا آوری اور احکام شرعیہ کی پابندی ضروری ہو۔ کیا کوئی صاحبِ نظر آدمی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال کر سکتا ہے کہ کسی اجتماعی نظریہ اور لائحہ عمل کو اُسکے بنیادی فلسفے، اُسکے نظامِ اخلاق اور اسکے تعمیر سیرت کرنے والے ارکان سے الگ کر کے چلایا جا سکتا ہے۔ اللہ کی حاکمیت کا تصور نکال دینے کے بعد اسلام کا نظامِ سیاسی آخر ہے کس چیز کا

نام؟ اور اگر قرآن کو ماخذِ قانون اور محمدؐ رسول اللہ کو رعیت (انسان) اور بادشاہ (اللہ) کے درمیان تنزیلِ احکام کا واحد مستند ذریعہ نہ مانا جائے تو کیا اسلامی طرز کے اسٹیٹ کی تعمیر ہوا پر کی جائیگی؟ نیز وہ کونسا نظامِ تمدن و سیاست ہے جو کسی نظامِ اخلاق کا سہارا لیے بغیر قائم ہو سکتا ہو؟ اور کیا اللہ کے سامنے انسان کی ذمہ داری و جواب دہی کا تخیل نکال دینے کے بعد اُس نظامِ تمدن و سیاست کے لیے کوئی اخلاقی سہارا باقی رہ جاتا ہے جس کا نقشہ اسلام نے پیش کیا ہے؟ کیا اس نظام کو آپ مادّہ پرستانہ اخلاقیات کے بل پر ایک دن کے لیے بھی قائم کر سکتے ہیں؟ مزید برآں وہ خاص قسم کی انفرادی سیرت اور جماعتی زندگی جو اس نظامِ تمدن و سیاست کے لیے درکار ہے، نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ کے سوا اور کس ذریعہ سے پیدا ہو سکتی ہے؟ اور وہ نہ ہو تو یہ نظام چل کہاں سکتا ہے؟ پس یہ غایت درجہ کا افلاسِ فکر ہے کہ کوئی شخص محض شاخوں کا حُسن دیکھ کر کہنے لگے کہ آؤ جڑ کے بغیر ان شاخوں ہی سے درخت قائم کریں۔

عملی حیثیت سے بھی اس قسم کی تمام تجویزیں سراسر غلط ہیں۔ ان سے اصل مقصد تک پہنچنے کے بجائے خطرہ یہ ہے کہ کہیں ہم خود ہی راستہ میں گم نہ ہو جائیں۔ ترمیم شدہ صورت میں جس نام نہاد اسلام کی تبلیغ کی جائیگی، ایک روز وہی اصلی معیار بن جائیگا، اور جو لوگ اس پر ایمان لا کر جماعت میں شریک ہونگے، نہ صرف وہ خود اصل اسلام کی طرف رجوع کرنے سے انکار کرینگے بلکہ وہ مصلحت پرست مسلمان بھی، جنہوں نے اُن سے کم و بیش پر سودا کیا تھا، انکے ساتھ انکی گمراہی میں شریک ہو جائینگے۔ مدارات (Compromise) پر جو کام مبنی ہوتے ہیں ان میں ہمیشہ یہی خرابی ہوتی ہے۔

۶۔ مشکلات کا جائزہ

اب ہمیں ایک نظر ان مشکلات پر ڈالنی چاہیے جن سے خوف زدہ ہو کر یہ انحراف کی راہیں اختیار کی جا رہی ہیں۔ کیا حقیقت میں وہ ایسی ہی مشکلات ہیں کہ ان کو حل نہیں کیا جا سکتا؟

تکرارِ بیان سے بچنے کے لیے میں ناظرین کو پھر ایک مرتبہ تکلیف دونگا کہ پیچھے پلٹ کر مضمون کے اُس حصہ پر نگاہ ڈال لیں جہاں میں نے ان مشکلات کی تشریح کی ہے۔

پہلی مشکل | پہلی مشکل کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام صرف تمدنی، سیاسی اور معاشی مسائل کا حل ہی پیش نہیں کرتا بلکہ عقائد، عبادات اور ضوابط شرعیہ کا ایک مجموعہ بھی اُسکے ساتھ دیتا ہے، اور اسکو قبول کرنے کے معنی انسان کی پوری زندگی کے تبدیل ہو جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چیز اسلام کو اُس طرح پھیلنے نہیں دیتی جسطرح دوسری تحریکیں پھیلتی ہیں۔ لیکن یہ مشکل بظاہر جتنی زبردست نظر آتی ہے، بباطن اتنی ہی کمزور اور بے حقیقت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی اجتماعی نظریہ اور مسلک بھی ایسا نہیں ہے جو انسانی زندگی کے عملی مسائل کا مجرد حل پیش کرتا ہو اور اسکے ساتھ اپنے کچھ اعتقادات اور اپنا ایک مخصوص فلسفہ نہ رکھتا ہو۔ چند امور مابعد الطبیعہ Metaphysical problems ایسے ہیں جنکے متعلق سلبی یا ایجابی حیثیت سے ایک نہ ایک رائے قائم کرنا بہرحال ہر اس مسلک کے لیے ناگزیر ہے جو انسان کے لیے ایک لائحہ زندگی بنانے کا عزم کرے۔ یہ سوالات کہ کائنات کا یہ نظام کس نوعیت کا ہے؟ اور اس نظام میں انسان کی کیا حیثیت ہے؟ اور انسان کی زندگی کا مآل کیا ہے؟ اور یہ کہ دنیا میں سب کچھ تو انسان کے لیے ہے مگر انسان خود کس کے لیے ہے؟ یہ دراصل زندگی کے بنیادی سوالات ہیں جنکا ایک قابلِ عمل حل Workable solution پیش کیے بغیر کوئی ذہنی، اخلاقی، تعلیمی اور تمدنی نظام بنایا ہی نہیں جا سکتا، اور کسی نظام کے بھی محض عملی پہلوؤں کو لے کر آدمی کام نہیں کر سکتا جب تک کہ ساتھ ساتھ اس کے بنیادی فلسفہ، یا بالفاظ دیگر اسکے اعتقادات کو بھی قبول نہ کرے۔ پس ایک اعتقادی نظام ہونا تنہا اسلام ہی کی کوئی انوکھی خصوصیت نہیں ہے۔ اس بہت سے اگر اسلام کی راہ میں کوئی مشکل حائل ہے تو ایسی مشکل ہر اجتماعی مسلک کی راہ میں حائل ہے۔ ہر اجتماعی مسلک فی الواقع ایک مذہب ہی

اور جو بھی اسکی پیروی اختیار کرتا ہے وہ حقیقت میں ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے خواہ اپنی سادہ لوحی کی بنا پر یہ کہتا اور سمجھتا رہے کہ بدستور اپنے پہلے مذہب پر ہوں۔

میں ایک سیدھی سی مثال سے اس نکتہ کی مزید توضیح کرونگا۔ یہ کمیونزم آپکے سامنے ہے۔ اسی کو مثال میں لے لیجیے۔ اگر اسلام اس مابعد الطبیعی نظریہ سے اپنے مسلک کی ابتدا کرتا ہے کہ خدا ہے، تو کمیونزم اس نظریہ سے چلتا ہے کہ خدا نہیں ہے یا کم از کم یہ کہ اسکا وجود و عدم وجود ہمارے لیے خارج از بحث ہے۔ اگر اسلام یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا خدا کی سلطنت ہے اور انسان یہاں اُس کا تابع امر ہے تو کمیونزم یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا ایک اتفاقی بساط ہے اور انسان یہاں مطلقاً خود مختار (Independent) ہے۔ اگر اسلام یہ پہلو لیتا ہے کہ انسان کو یہاں کام کرنے کے لیے خدا کی ہدایت درکار ہے اور وہ وحی کے ذریعہ سے آتی ہے تو کمیونزم یہ پہلو لیتا ہے کہ کوئی ہدایت درکار نہیں ہے اور وحی نہیں آتی۔ اگر اسلام اس مقام سے سلوک کا آغاز کرتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جس میں انسان کو اپنی موجودہ زندگی کے پورے کارنامے کا حساب دینا ہے تو کمیونزم اس مقام سے چلتا ہے کہ جو کچھ ہے یہی زندگی ہے اور بعد میں نہ زندگی ہے نہ حساب کتاب۔ دیکھیے، یہ دونوں یکساں مابعد الطبیعی نظریے ہیں اور دونوں میں سے کسی کو بھی تجربہ یا مشاہدہ سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اب اگر کسی سائنٹفک ثبوت کے بغیر محض استدلال اور قلبی شہادت کی بنا پر بہت سے وہ لوگ جو کل تک کمیونسٹ نہ تھے، آج کمیونزم کے نقطۂ نظر کو قبول کر سکتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ آخر انہی دو بنیادوں پر بہت سے وہ لوگ جو آج مسلم نہیں ہیں، کل اسلام کا نقطۂ نظر کیوں قبول نہیں کر سکتے؟

اسی طرح ایک ہادی پر ایمان لانے کا معاملہ بھی دونوں میں مشترک ہے۔ اگر مسلم ہونے کے لیے محمد رسول اللہ پر ایمان لانا پڑتا ہے تو کمیونسٹ بھی آخر مارکس پر ایمان لاتا ہی ہے۔ پھر اگر ایک شخص جو کل تک مارکسی نہ تھا، آج مارکس کی تعلیمات کو دیکھ کر اسکو اپنا رہنما تسلیم کر سکتا ہے، تو آخر کونسی چیز مانع ہے کہ

ایک وہ شخص جو کل تک مسلم نہ تھا، آج محمد رسول اللہ کی زندگی، انکی تعلیمات اور ان کے کارنامے کو دیکھ کر ان کو اپنا ہادی اور رہبر نہ تسلیم کرلے؟

ایسا ہی معاملہ جماعتی ضوابط (Party-discipline) کا بھی ہے۔ اگر اسلام اُن لوگوں کو جو اسکی جماعت میں شامل ہوں، اپنے کچھ ضوابط کا پابند بناتا ہے تو کیا کمیونسٹ پارٹی اُن لوگوں کو جو اس میں شامل ہوں کسی ضابطہ اور کسی قاعدے میں نہیں جکڑتی؟ پھر جب بہت سے انسان کمیونزم کے اصولوں پر ایمان لانے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے ضوابط کی پابندی قبول کر لیتے ہیں تو آخر اسلام ہی کے جماعتی ضوابط میں کونسا ہوّا چھپا ہوا ہے کہ جو لوگ اسلام کے اصولوں کو جانچ کر ان پر ایمان لانے کے لیے تیار ہونگے انکو یہ ہوّا اپنی صورت دکھا کر بھگا دیگا؟

اس مثال سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام میں خدا کی ہستی اور اسکی توحید کا اعتقاد، یا آخرت کا اعتقاد، یا پیغمبر کی ناقابل منازعت پیشوائی (Indisputable leadership) اور قرآن کے آخری منبع قانون ہونے کا اعتقاد شرط لازم ہونا، اور نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ضوابط کی پابندی فرض ہونا، ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اسکے پھیلنے اور غیر مسلموں کے اسکی طرف کھچ کر آنے میں سدِراہ ہو۔ مابعد الطبیعی اعتقادات اور جماعتی ضوابط دوسرے مسلکوں میں بھی موجود ہیں، اور جو انسان اِن مسلکوں میں اپنی زندگی کے مسائل کا حل اپنی سمجھ کے مطابق صحیح پاتے ہیں وہ اِن کے عقائد اور ضوابط، دونوں کو قبول کرتے ہی ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں اگر اسلام انکے سامنے تمام مسائل زندگی کا بہترین حل پیش کرے، اور انکی اپنی فلاح و سعادت کا راستہ کھول کر سامنے رکھ دے، تو عقائد اور ضوابط کی شرط صرف اسلام ہی کے معاملہ میں ان کے لیے غیر معمولی رکاوٹ ثابت ہو۔ رکاوٹ اگر ہے تو فی الواقع صرف اسی حد تک ہے کہ لوگوں کے لیے بالعموم اپنے پرانے مسلک کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مسلک اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن جو تحریک بھی دنیا میں پھیلتی ہے اسے بہرحال اس رکاوٹ سے سابقہ پیش آتا ہی ہے اور جو لوگ کسی تحریک پر ایمان لاتے ہیں وہ

بہر حال اس رکاوٹ کو عبور کر کے ہی قدم آگے بڑھا سکتے ہیں۔ اس کو سامنے کھڑا دیکھ کر راستہ کترانے کی کوشش صرف وہی شخص کریگا جو یا تو اپنے ایمان ہی میں صادق نہیں ہے یا پست ہمت اور ناکارداں ہے۔

البتہ اسلام کے حق میں اس رکاوٹ کو جس چیز نے شدید تر رکاوٹ بنا دیا ہے وہ ہماری یہ جامد اور بے روح مذہبیت ہے جسے آج کل اسلام سمجھا جا رہا ہے۔

اس بے روح مذہبیت کا پہلا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلام کے عقائد اور عبادات کا کوئی ربط اجتماعی نظام اور کاروبارِ حیات دنیا سے قائم نہیں رہا ہے۔ اسلام کے عقائد محض ایک دھرم Religion کے مزعومات (Dogmas) بنا کر رکھ دیے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک مکمل فلسفۂ اجتماع اور نظامِ تمدن کی منطقی بنیاد ہیں۔ اور اسی طرح اسکی عبادات محض پوجا اور تپسیا بنا کر رکھ دی گئی ہیں حالانکہ وہ اُن ذہنی اور اخلاقی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کرنے کے وسائل ہیں جن پر اسلام نے اپنا نظام اجتماعی تعمیر کیا ہے۔ اس عملِ تحریف کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ آخر ایک سیاسی، معاشی اور تمدنی لائحۂ عمل کو چلانے کے لیے اِن عقائد اور عبادات کی ضرورت ہی کیا ہے۔

دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جسکی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہدِ گذشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے اور اسلام کی تعلیم دینے والی درسگاہیں آثارِ قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ تاریخی ذوق کی بنا پر اظہارِ قدر شناسی تو کر سکتے ہیں، مگر یہ توقع ان سے نہیں کی جاسکتی کہ وہ حال کی تدبیر اور مستقبل کی تعمیر کے لیے اُس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کرینگے۔

تیسرا اہم نقص اس میں یہ ہے کہ جزئیات کی ناپ تول، مقداروں کے غیر منصوص تعیُّن، اور روح سے بڑھ کر مظاہر پر مدارِ دین داری رکھنے کی بیماری اس میں حد سے بڑھ گئی ہے، اور وہ غیروں کی تالیف تو کیا

کرے گی اُلٹی اپنوں کی تنفیر کا سبب بن رہی ہے۔ اس غلط مذہبیت کے علمبرداروں کی زندگی دیکھ کر اور اُن کی باتیں سن کر آدمی اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ انسان کی ابدی فلاح و خسران کا مدار کیا اِنہی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہے جن پر یہ لوگ اتنا زور دیتے ہیں؟

اسلام کے راستہ میں یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے مگر یہ اسلام کا قصور نہیں، ہمارا اپنا قصور ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اپنے اُس نظام تعلیم کو بدلیں جس نے دین کے تصور کو اتنا غلط اور شریعت کے علم کو اس قدر جامد بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک زندہ تحریک محض عقائد کے بل پر تو نہیں اُٹھ سکتی۔ ہمیں اس کے عقائد کو معقول دلائل کے ساتھ پیش کرنا ہوگا، پھر عقائد کے ساتھ عبادات کا اور عبادات کے ساتھ قوانینِ زندگی کا منطقی ربط واضح کرنا پڑیگا، پھر ان قوانین کو زندگی کے تمام عملی مسائل پر منطبق کر کے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ جتنی انسانی ضروریات ہیں اُن سب کا حل اِن قوانین میں موجود ہے، تب کہیں لوگ اس نظام کو ایک معقول نظام کی حیثیت سے سمجھ سکینگے، اور جب وہ اسے سمجھینگے تو قبول بھی کرنے پر آمادہ ہونگے۔ یہ تعبیری کام چونکہ سخت محنت طلب ہے اسلیے اس محنت سے جی چرا کر لوگ بنے بنائے آسان راستوں کی طرف دوڑ جاتے ہیں، مگر یہ نہیں سوچتے کہ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے راستہ بنانے کی زحمت بہرحال ہمیں اٹھانی ہی پڑیگی۔ جس نے بھی کوئی مقصدِ عظیم پیشِ نظر رکھا ہے اسے یہ زحمت اٹھانی پڑی ہے، اور اگر واقعی ہم اپنے مقصد میں صادق ہیں تو ہمیں اس کام کے لیے تیار ہونا چاہیے۔

دوسری مشکل اب دوسری مشکل کو لیجیے۔ جن تعصبات کو اسلام کی راہ میں حائل بتایا جاتا ہے ان کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

ایک قسم کا تعصب تو وہ ہے جو طبعاً ہر شخص کے اندر ہر اُس چیز کے خلاف ہوتا ہے جو اُس کے لیے نئی ہو، جس پر اس نے اپنے باپ دادا کو نہ پایا ہو، اور جس سے وہ مانوس نہ ہو۔ یہ تعصب صرف آج ہی اسلام کی راہ میں حائل نہیں ہے، پہلے بھی حائل تھا۔ اور جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں، صرف اسلام ہی کی راہ

میں حائل نہیں ہے، ہر تحریک کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ تاہم یہ ایسی رکاوٹ نہیں ہے جسکو دور نہ کیا جاسکتا ہو۔ پہلے بھی اس رکاوٹ کے باوجود اسلام پھیلا ہے اور اب بھی پھیل سکتا ہے۔

دوسری قسم کا تعصب وہ ہے جو دراصل اسلام کے خلاف نہیں بلکہ مسلمانوں کے خلاف پیدا ہوا ہے اور مسلمانوں کے واسطے سے اسلام کی راہ میں حائل ہو گیا ہے۔ مسلمانوں نے پچھلی کئی صدیوں میں جو غیر اسلامی طریقے اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اختیار کیے، اور اب بھی اپنے انفرادی کردار اور اجتماعی رویے میں جس غیر اسلامی سیرت کا وہ اظہار کر رہے ہیں، یہ سارے تعصبات فی الحقیقت اسی کے بھڑکائے ہوئے ہیں۔ اس واقعہ سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ہندوستان کو اصلی اسلامی حکومت، خالص اسلامی اخلاق اور حقیقی اسلامی تمدن سے لذت آشنا ہونے کا کبھی موقع ملا ہی نہیں۔ گذشتہ زمانہ میں مسلمان بادشاہوں نے، مسلمان امرا نے، مسلمان حکام اور اہل کاروں اور سپاہیوں نے، مسلمان زمینداروں اور رئیسوں نے اور مسلمان عوام نے اپنے برتاؤ سے اسلام کا جو نمونہ پیش کیا وہ ہرگز ایسا نہ تھا کہ اس ملک کے عام باشندوں کو اسلام کا گرویدہ بنا سکتا۔ بلکہ اسکے برعکس نفسانی اغراض کے لیے جو کشمکش انکے اور غیر مسلم عناصر کے درمیان مدتہائے دراز تک برپا ہوتی رہی اُس نے اسلام کے خلاف مستقل تاریخی تعصبات پیدا کر دیے۔

اس تاریخی پس منظر کے ساتھ اسلام کا جو نمونہ آج اس زمانہ میں مسلمان اپنی انفرادی زندگی اور اجتماعی طریقِ کار سے پیش کر رہے ہیں وہ بھی کچھ ایسا خوبصورت نہیں ہے کہ اس قسم کے نمونے کو دیکھ کر لوگ اُس تحریک کے عاشق ہو جائیں جسکی نمائندگی اس شان سے کی جارہی ہو۔ انفرادی زندگی میں ایک عام مسلمان ایک عام غیر مسلم سے آخر کس چیز میں برتر نظر آتا ہے کہ لوگ اُس برتری کے منبع کی جستجو کریں؟ اس کے برتاؤ میں، اسکے اخلاق میں، اسکے معاملات میں کہاں کوئی خفیف سی چمک بھی ایسی نمودار ہوتی ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ شخص فائق تر اور پاکیزہ تر اصولوں کا پیرو ہے؟ کیا ایک مسلمان زمیندار یا شریف اصطلاحی "کمینوں" کے مقابلہ میں اپنے طبقہ کے کسی غیر مسلم "شریف" یا رئیس سے کچھ کم نخوت برتتا ہے؟

کیا ایک مسلمان تاجر یا پیشہ ور آدمی اپنے ہم پیشہ غیر مسلم سے کچھ زیادہ متدین ہوتا ہے؟ کیا ایک مسلمان حاکم یا عہدہ دار اپنے اختیارات کے استعمال میں کسی غیر مسلم ہم سر سے کچھ بہتر اخلاقی اصولوں کی پیروی کرتا ہے؟ کیا دفتروں کے مسلمان ملازم رات دن انہی تمام ذلیل طریقوں کی پیروی نہیں کرتے ہیں جنکی پیروی انکے غیر مسلم ساتھی کرتے ہیں؟ کیا وہی جائز و ناجائز طریقوں سے اپنی قوم کا تعصب، وہی کمینہ چالوں سے غیر قوم والوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کرنا، اور اپنی چھوٹی چھوٹی دنیوی اغراض کے پیچھے لڑتے مرنا جسکی شکایت یہ غیر مسلموں سے کرتے ہیں، خود ان کا بھی رات دن کا مشغلہ نہیں ہے؟ پھر جب ایک غیر مسلم اسلام کے ان نمائندوں کی زندگی میں کہیں بھی کوئی فوقیت کا نشان نہیں پاتا، جب وہ انہیں بھی وہی سب کچھ کرتے دیکھتا ہے جو وہ خود کرتا ہے، اور جب وہ انہیں بھی انہی مقاصد کے لیے لڑتے جھگڑتے، اور کشمکش کرتے دیکھتا ہے جنکے لیے وہ خود لڑتا، جھگڑتا اور کشمکش کرتا ہے، تو آخر کونسی چیز اسکو اُس مسلک کی طرف مائل کر سکتی ہے جسکی نمائندگی یہ لوگ کر رہے ہیں۔ بلکہ جب ایک ہی نفسانیت اور دنیا پرستی کے میدان میں وہ اور یہ برابر کے حریف ہیں تو اپنے حریفوں کے مسلک پر وہ کھلے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہی کیوں محسوس کرنے لگا؟ ایک طرف پچھلے تاریخی تعصبات، اور پھر آج کی نفسانی کشمکش، کیا یہ دونوں چیزیں اسکے دل کے دروازوں پر قفل چڑھانے کے لیے کافی نہیں؟

انفرادی زندگی سے وسیع تر، قومی دائرے میں مسلمان اس وقت تک جس پالیسی پر چلتے رہے ہیں، اور آج جس پالیسی پر مُصر ہیں، بلکہ جسے اپنی حیات اجتماعی کا ضامن سمجھ رہے ہیں وہ کیا ہے؟ اصول اسلام اور مقاصد اسلام کا کہیں نام تک نہیں آتا۔ کسی خطبے، کسی تقریر، کسی ریزولیوشن میں آپ ایک فقرہ ایسا نہیں پاسکتے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہ لوگ اپنی اغراض اور اپنے دنیوی مقاصد کے لیے نہیں بلکہ انسانوں کی فلاح کے لیے عالمگیر کلّی اصول لیکر اُٹھے ہیں اور انکی لڑائی محض اصولِ حق کی خاطر ہے۔ اسکے برعکس آپ یہ دیکھینگے کہ اِن کے اور دوسری قوموں کے درمیان بالکل برابر کی

قوم پرستانہ جنگ برپا ہے، دونوں ایک سطح پر اتر آئے ہیں، ایک ہی مرتبہ کی دنیوی اغراض کے لیے کشمکش کر رہے ہیں، ایک ہی قسم کی چالیں (Tactics)، زبان، اصطلاحات اور اصولِ نزاع اختیار کر رہے ہیں، اور سارا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا انہی چیزوں کے لیے ہے جنکے لیے انکے حریفوں کا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا ہے۔ پھر کس طرح یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ جن لوگوں سے آپ دنیوی اغراض کے لیے مساوی مرتبہ پر لڑ رہے ہوں، جن سے آپ رقابت اور حریفی کا پرانا اور تازہ رشتہ رکھتے ہوں، جنکے ساتھ آپ کی سیاسی اور معاشی مفادات کے لیے کشمکش برپا ہو، وہ آپ کی طرف سے کسی اصولی تحریک کی دعوت پر اسی طرح کھلے دل سے غور کرنے کے لیے تیار ہونگے جس طرح وہ اشتراکیت یا ڈیموکریسی یا کسی اور مسلک کی دعوت کے لیے تیار رہتے ہیں؟

یہ تعصبات اسلام کے راستہ میں دوسری عظیم الشان رکاوٹ ہیں، مگر ان کا علاج یہ نہیں ہے کہ ہم ان تعصبات کی پیدائش کے سبب کو باقی رکھیں اور پھر انکی موجودگی کو بہانہ بنا کر اپنے مقصد کی طرف براہ راست پیش قدمی کرنے سے منہ موڑیں، بلکہ انکا اصلی علاج یہ ہے کہ ہم اپنے انفرادی اور اجتماعی طرزِ عمل کو بدلیں اور اس طرح تمام تعصبات کی جڑ کاٹ کر اپنے مقصد کی طرف بڑھنے کے لیے سیدھا راستہ تیار کریں۔ جو لوگ محض سرسری نگاہ ہیں یہ دیکھ کر کہ اسلام کے خلاف ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، تمام قوموں میں سخت تعصبات پھیلے ہوئے ہیں، یہ فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ اس حالت ہیں اسلام ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے نہیں پھیل سکتا، وہ دراصل واقعات کو غلط رنگ میں دیکھتے اور غلط نتائج نکالتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر ثابت کیا ہے، یہ تعصبات اسلام اور اسلامی سیرت کے بھڑکائے ہوئے نہیں ہیں (جس سے ان قوموں کو ہندوستان میں کم ہی سابقہ پیش آیا ہے) بلکہ اسلام کے ان غلط نمائندوں کی روش سے پیدا ہوئے ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود غیر اسلامی طریقوں پر چلتے رہے اور خالصتہً للہ کام کرنے کے بجائے اپنی دنیوی اغراض اور نفسانی خواہشات کے لیے کام کرتے رہے۔ لہٰذا ان تعصبات کے تدارک کی صحیح صورت یہ ہے کہ

اب اپنی سیرت، اپنے اعمال اور اپنی اجتماعی جدوجہد سے اسلام کی صحیح نمائندگی کیجیے، نہ یہ کہ تعصبات کی موجودگی کو اُسی غلط روش پر چلنے کے لیے حجت بنائیے جسکی وجہ سے تعصبات پیدا ہوئے ہیں۔ بالفرض اگر یہ مان لیا جائے کہ قومی تعصبات کی موجودگی میں اسلام کا ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے چلنا محال ہے، تو سوال یہ ہے کہ اسلامی مقاصد کے بجائے مسلمانوں کے دنیوی مفاد کے لیے جو کشمکش آپکے اور دوسری قوموں کے درمیان برپا ہے اور انکے قوم پرستانہ طریقوں کے جواب میں ویسے ہی قوم پرستانہ طریقے جس طرح آپ اختیار کر رہے ہیں، کیا اس سے یہ تعصبات کبھی قیامت تک بھی دور ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں، تو پھر یہ نہ کہیے کہ اِس وقت کچھ خاص حالات ایسے ہیں جنکی وجہ سے اسلام ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے نہیں چل سکتا، بلکہ یوں فرمائیے کہ آئندہ بھی ہمیشہ ایسے ہی حالات موجود رہینگے اور اگر اسلام آپ ہی کا ورثۂ آبائی بنا رہا تو وہ ہمیشہ بنی اسرائیل کی طرح محض آپکا قومی مذہب بن کر رہ جائیگا، کبھی ایک عالمگیر دعوت نہ بن سکے گا۔

یہ انسانی فطرت کا اقتضا ہے کہ خود غرضی کے جواب میں خود غرضی اور قوم پرستی کے جواب میں قوم پرستی پیدا ہوتی ہے۔ بخلاف اسکے بے غرضانہ حق پرستی کے مقابلہ میں تمام تعصبات اور تمام مخالفانہ جذبات آخر کار ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور ایک سچے بے لوث حق پرست کے آگے انسان عقیدت و محبت کے سوا کوئی اور چیز پیش کرنے پر قادر ہی نہیں رہتا۔ اگر مسلمان اپنی وہی حیثیت قائم رکھتے جو دراصل اِنکی تھی تو یہ ممکن نہ تھا کہ ہندوستان میں اِن کے خلاف وہ تعصبات پائے جاتے جنکی آج شکایت کی جاتی ہے۔ لیکن انہوں نے خود اپنی وہ حیثیت کھو دی۔ دنیوی فائدوں کے لیے دوسری قوموں سے لڑنے جھگڑنے لگے، اور اصولِ حق کے بجائے اپنی اغراض ذاتی و قومی کو انہوں نے اپنی جدوجہد کا محور بنا لیا۔ اس کے جواب میں اگر دوسروں کے اندر تعصب نہ پیدا ہوتا تو تعجب کی بات تھی۔ جن اصولوں کا آپ نام لیتے ہیں، اُنکی خود پیروی نہیں کرتے بلکہ رات دن اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں انکے خلاف عمل کرتے رہتے ہیں۔ جس مقصدِ عالی

کا آپ اظہار کرتے ہیں، آپکی عملی جدوجہد اُس مقصد کے لیے نہیں ہے بلکہ آپکے افراد انفرادی طور پر اور آپکی پوری جماعت بحیثیت مجموعی اُسکو پسِ پشت ڈال کر دوسرے مقاصد کے پیچھے چلی جارہی ہے۔ اس صورت میں اگر اپنے خیالی نصب العین اور اپنے محض زبانی اصولوں کے لیے آپکا اپیل دوسروں پر کارگر نہ ہو، اگر وہ اس اپیل میں آپ کو جھوٹا سمجھیں اور آپکی تبلیغ کو محض ایک خود غرضانہ چال سمجھ کر حقارت سے رد کردیں، تو آخر اس میں حیرت کی بات ہی کونسی ہے۔

ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم مسٹر جناح کے ۱۴ یا ۲۴ نکات پر تو ایمان نہیں لاسکتا۔ نہ مسلم لیگ یا مجلس احرار یا جمعیت العلماء کے ریزولیوشنوں میں کوئی ایسی چیز ہے جس پر کوئی ایمان لائے۔ ایمان اگر کوئی لاسکتا ہے تو لا الٰہ الا اللہ پر لاسکتا ہے بشرطیکہ ایک جماعت اسی کلمہ کے لیے جینے اور اسی پر مرنے والی اسکے سامنے موجود ہو۔ مگر وہ ہے کہاں؟ کونسی جماعت آپکے اندر ایسی موجود ہے جس نے خالص اطاعتِ حق کو اپنا مسلک اور خالص دینِ حق کے قیام کو اپنی کوششوں کا مرکز و محور بنا لیا ہو؟ لوگ اسلام کی دعوت اور اسکے اصولِ حق کو کتابوں میں دیکھتے ہیں اور انکے معترف ہو جاتے ہیں۔ مگر اس اسلام پر عمل کرنے والی اور اسکے نصب العین کے لیے کام کرنے والی سوسائٹی انکو کہیں نہیں ملتی۔ پھر وہ جائیں تو آخر کہاں جائیں؟ کیا اُس سوسائٹی میں شامل ہوں جو رات دن دنیا ہی کے پیچھے مری جاتی ہے اور انہی راستوں پر چلی جارہی ہے جن پر غیر مسلم چلتے ہیں؟ آپکی ایک جماعت لڑتی ہے اس لیے کہ ارضِ ہند پر انگریز کے بجائے ہندوستانی کا اقتدار قائم ہو۔ بعینہٖ یہی چیز ایک شخص کو غیر مسلم جماعتوں میں بھی مل جاتی ہے۔ پھر وہ آپکے پاس کیوں آئے؟ آپکی دوسری جماعت لڑتی ہے اس لیے کہ ہندو کے مقابلے میں نسلی مسلمانوں کے دنیوی مفاد کا تحفظ کیا جائے۔ یہ چیز اُسکو خود اپنی قوم پرستی کی مد مقابل نظر آتی ہے۔ پھر وہ اپنی قوم پرستی کو چھوڑ کر آپکی قوم پرستی پر کیوں ایمان لائے؟ انسان کو غیر اللہ کے تسلط سے آزاد کرانے والی جماعت آپ میں ہے کہاں کہ کوئی اس کے اصول و مقاصد

پر ایمان لائے اور اس میں شامل ہونے کے لیے آگے بڑھے!

تیسری مشکل سب سے بڑی گتھی جو ہمارے سوچنے والے دماغوں کے لیے ناقابلِ حل بن گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کروڑوں کی تعداد میں ایک ایسی قوم بستی ہے جو نہ پوری مسلمان ہے نہ پوری غیر مسلم۔ اس قوم کے اس حال میں یہاں موجود ہونے سے متعدد پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں جنکا کوئی حل لوگوں کو نہیں ملتا اور اسی وجہ سے رہنما اور کارکن سب پراگندہ عمل ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں اُن چند بڑی بڑی الجھنوں کی طرف اشارہ کرونگا جو اس صورتِ حال نے پیدا کر دی ہیں:۔

بعض لوگ لفظ مسلمان سے دھوکا کھا کر اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ اصل سوال اسلام کے احیاء (Revival) کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے احیاء کا ہے۔ یعنی یہ قوم جو مسلمان کے نام سے پائی جاتی ہے، اس کو ایک زندہ اور طاقتور قوم بنانا اور برسرِعروج لانا اصل مقصود ہے اور اسی کا نام اسلام کا احیاء ہے۔ یہ غلط فہمی انکو "مسلم قوم پرستی" کی حد تک کھینچ لے گئی ہے۔ جس طرح مونجے اور ساورکر کے لیے سوال ہندو قوم کے عروج کا ہے، جس طرح مسولینی کے لیے اطالوی قوم اور ہٹلر کے لیے جرمن قوم کے عروج کا سوال ہے، اسی طرح ان "مسلم قوم پرستوں" کے لیے اصل سوال اُس مسلمان قوم کے عروج کا ہے جس میں یہ پیدا ہوئے ہیں اور جسکے ساتھ انکی قسمتیں وابستہ ہیں۔ یہ اسلام کی خدمت اسکو سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعلیم (قطع نظر اس سے کہ وہ تعلیم کیسی ہی ہو)، اُنکی معاشی خوشحالی (خواہ وہ کسی قسم کے ذرایع سے حاصل ہو) اور انکی سیاسی و عسکری تنظیم (مجرّد قومی تنظیم) پر اپنا زور صرف کیا جائے، اور اُن کو ایک زبردست قوم بنا دیا جائے۔ پھر جب یہ انکا مقصد قرار پایا تو انہوں نے معاملات کو اس نظر سے دیکھنا شروع کیا کہ کونسی تدابیر اِس مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہو سکتی ہیں۔ اور جو تدبیریں بھی ان کو دنیا میں قومی عروج کے لیے مفید و کارگر نظر آئیں انکو بے تکلف انہوں نے استعمال کرنا شروع کر دیا خواہ وہ اسلام سے انکو کتنی ہی دور لے جانے والی ہوں۔ یہ ذہنیت سر سید احمد خاں کے وقت سے آج تک مسلمانوں کے

اکثر و بیشتر رہنماؤں، کارکنوں اور اداروں پر مسلط ہے۔ اسلام کے نام سے جو کچھ سوچا جا رہا ہے مسلمانوں کے لیے سوچا جا رہا ہے اور اسلام کی قید سے آزاد ہو کر سوچا جا رہا ہے۔

کچھ دوسرے لوگ اسلام اور مسلمان کو اس حیثیت سے تو خلط ملط نہیں کرتے، لیکن ایک دوسری حیثیت سے وہ اسلام کے مستقبل کو موجودہ نسلی مسلمانوں کے دامن سے باندھ دیتے ہیں۔ وہ چاہتے تو اسلام ہی کا احیا ہیں، مگر ان کا خیال یہ ہے کہ اسلام کا احیاء موقوف ہے اُن سب مسلمانوں کے مکمل مسلمان بن جانے پر جو اس وقت قومی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک یہ سارے کے سارے مسلمان ذہنی اخلاقی اور عملی حیثیت سے تبدیل نہ ہو جائیں، قدم آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ اور یہ چیز چونکہ سخت دشوار بلکہ محال نظر آتی ہے، اس لیے یہ لوگ اصل مقصد کی طرف پیش قدمی کرنے کے بجائے اِدھر اُدھر کے فضول کاموں میں مختلف ضمنی مقاصد کے پیچھے اپنی قوتیں ضائع کر رہے ہیں۔

کچھ اور لوگ ہیں جن کے سامنے اسلامی نصب العین قریب قریب بالکل واضح ہو چکا ہے اور وہ اسکی طرف بڑھنا بھی چاہتے ہیں مگر یہ سوال انکو بار بار پریشان کرتا ہے کہ اگر ہمارے کارفرما دماغ اور کارکن ہاتھ سب کے سب اسلامی نصب العین کے لیے جدوجہد کرنے میں لگ جائیں تو آخر موجودہ کافرانہ نظام تمدن و سیاست اور اس کے آئندہ تغیرات میں ہماری قوم کے سیاسی و معاشی مفاد کا کیا حشر ہو گا۔ اس سوال کی اہمیت انکی نگاہ میں اتنی زیادہ ہے کہ وہ اپنے عزم سفر کو ملتوی کر کے کہتے ہیں کہ پہلے اس سوال کو حل کیا جائے اور راہِ اصل مقصد کی طرف قدم اُس وقت بڑھایا جائے جب اپنی قوم کا کوئی مسئلہ ہمارے لیے حل طلب باقی نہ رہے۔

لیکن یہ تمام الجھنیں غیر اسلامی طرزِ فکر اور غیر اسلامی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔ اگر خالص مسلمان ہونے کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان میں سے کوئی الجھن بھی ہمارے لیے الجھن نہیں رہتی۔ ہمارے سامنے اصل سوال کسی قوم کے احیاء کا نہیں بلکہ مسلکِ اسلام کے احیاء کا ہے۔ قوم کے احیاء کا خیال دماغ سے نکالتے ہی وہ تمام مسائل کافور کی طرح اڑ جاتے ہیں جو قومیت کی اصطلاحوں میں سوچنے والے لوگوں کو

پریشان کیا کرتے ہیں۔ جب ہم مسلکِ اسلام کے پیرو ہیں اور اسکو فروغ دینا ہمارا مقصد ہے تو ہمیں کسی ایسے مفاد سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی نہیں ہو سکتی جو کسی غیر اسلامی نظام سے وابستہ ہو یا اصول اسلام سے متصادم ہو۔ ہم اپنے دماغ کو اُس کے لیے سوچنے کی کچھ بھی زحمت نہ دینگے۔ قومی احیاء کی اُن تمام تدبیروں سے بھی ہمارا کوئی تعلق نہ ہوگا جو غیر اسلامی اصول پر مبنی ہوں۔ ایک قوم اور دوسری قوم کی باہمی کشمکش، اور ایک قوم پر دوسری قوم کے تفوق کی کوششوں سے بھی ہم پوری تبرّی کرینگے۔ ہم کو جو کچھ بھی دلچسپی ہوگی اسلامی نظامِ فکر و عمل سے، اسکی تبلیغ و اشاعت سے، اور اسکو حکمراں بنانے کی سعی و جہد سے ہوگی۔ مسلمانوں سے ہمارا تعلق صرف اسی حد تک ہوگا جس حد تک ان کا تعلق اسلام سے ہے۔ جو اپنی خواہشِ نفس اور ہر غیر اللہ کی بندگی چھوڑ کر صرف اللہ کی بندگی میں آجائے وہ ہمارا بھائی اور ہمارا رفیق ہے، خواہ وہ نسلی مسلمانوں میں سے آئے یا غیر مسلموں میں سے۔ ہم پیدائشی مسلمانوں کو بھی اسی مسلک کی طرف دعوت دینگے اور پیدائشی غیر مسلموں کو بھی۔ ہمارے نزدیک اسلام کا دامن نسلی مسلمانوں کے دامن سے بندھا ہوا نہ ہوگا کہ یہ اٹھیں تو وہ بھی اٹھے اور یہ نہ اٹھیں تو وہ بھی نہ اٹھے۔ اسلام اِن کے باپ دادا کی جائداد نہیں ہے۔ یہ اُسکے لیے جینے اور اُسی کے لیے مرنے پر تیار رہیں تو ہم خوش اور ہمارا خدا خوش۔ ورنہ جس جہنم میں اِن کا جی چاہے جا کر گر جائیں۔ ہم اللہ کا کلمہ دوسرے انسانوں کے پاس لے جائینگے۔

یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں بعینہٖ یہی طرزِ عمل انبیاء و رسل کا تھا اور اسی کو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا۔ قرآن میں جن کو اہلِ کتاب کہا گیا ہے وہ آخر "نسلی مسلمان" ہی تو تھے۔ خدا اور ملائکہ اور نبی اور کتاب اور آخرت، سب کو مانتے تھے، اور عبادات و احکام کی رسمی پیروی بھی کرتے تھے۔ البتہ اسلام کی اصل روح، یعنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر دینا اور دین میں شرک نہ کرنا، یہ چیز اُن میں سے نکل گئی تھی۔ اب دیکھیے، کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس "نسلی مسلمان قوم" کے

احیار پر اپنی کوششوں کو مرکوز فرمایا تھا؟ نہیں۔ کیا آپ نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جب تک یہ سارے کے سارے "نسلی مسلمان" اصلی مسلمان نہ بن جائینگے قدم آگے نہ بڑھایا جائیگا؟ یہ بھی نہیں۔ کیا آپ نے ان "نسلی مسلمانوں" کے دنیوی مسائل کو حل کرنے تک اقامتِ دین کی کوششوں کو ملتوی رکھا تھا؟ یہ بھی نہیں۔ پھر آپ نے کیا کیا؟ سب جانتے ہیں کہ آپ نے تمام معاملات اور تمام مسائل سے قطع نظر کر کے "نسلی مسلمانوں" اور غیر مسلموں، سب کو خالص اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دی، جس نے اسکو قبول کیا اور غیر اللہ کی بندگی و اطاعت ترک کر دی اسے اپنے جتھے میں شامل کر لیا اور پھر ان لوگوں کو لے کر الٰہی نظام اطاعت یعنی دین حق کو قائم کرنے کے لیے براہِ راست جدوجہد شروع کر دی یہاں تک اسکو قائم کر کے چھوڑا۔

ٹھیک یہی طریقہ ہے جسکی پیروی کو میں حق سمجھتا ہوں، اسی کی پیروی خود کرنا چاہتا ہوں، اور اسی کا مشورہ ان سب لوگوں کو دیتا ہوں جن کا نصب العین اسلامی ہے۔

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے

اس مقالہ میں مجھے اُس عمل Process کی تشریح کرنی ہے جس سے ایک طبعی نتیجہ کے طور پر اسلامی حکومت وجود میں آتی ہے۔ آجکل میں دیکھ رہا ہوں کہ اسلامی حکومت کا نام بازیچۂ اطفال بنا ہوا ہے مختلف حلقوں سے اس تصور اور اس مقصد کا اظہار ہو رہا ہے مگر ایسے ایسے عجیب راستے اس منزل تک پہنچنے کے لیے تجویز کیے جا رہے ہیں جن سے وہاں تک پہنچنا اتنا ہی محال ہے جتنا موٹر کار کے ذریعے سے امریکہ تک پہنچنا۔ اس خام خیالی (Loose-thinking) کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے جسکا نام "اسلامی حکومت" ہو، مگر خالص علمی (Scientific) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ اس حکومت کی نوعیت کیا ہے، اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ وہ کیونکر قائم ہوا کرتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ علمی طریق پر اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی جائے۔

نظام حکومت کا طبعی ارتقار

جو لوگ اجتماعیات میں کچھ بھی نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ حکومت خواہ کسی نوعیت کی ہو مصنوعی طریقہ سے نہیں بنا کرتی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بنکر تیار ہو اور پھر اُدھر سے لاکر اسکو کسی جگہ جما دیا جائے۔ اسکی پیدائش تو ایک سوسائٹی کے اندر اخلاقی، نفسیاتی، تمدنی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبعی طور پر ہوتی ہے۔ اسکے لیے کچھ ابتدائی لوازم (Prerequisites)، کچھ اجتماعی محرکات، کچھ فطری مقتضیات ہوتے ہیں جنکے فراہم ہونے اور زور کرنے سے وہ وجود میں آتی ہے۔ جس طرح منطق میں آپ دیکھتے ہیں کہ نتیجہ ہمیشہ مقدمات (Premises) کی ترتیب ہی سے برآمد ہوا کرتا ہے، جس

طرح علم الکیمیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کیمیاوی مرکب ہمیشہ کیمیاوی کشش رکھنے والے اجزاء کے مخصوص طریقہ پر ملنے ہی سے برآمد ہوتا ہے، اسی طرح اجتماعیات میں بھی یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ ایک حکومت صرف اُن حالات کے اقتضاء کا نتیجہ ہوتی ہے جو کسی سوسائیٹی میں بہم ہو گئے ہوں۔ پھر حکومت کی نوعیت کا تعین بھی بالکلیہ اُن حالات کی کیفیت پر منحصر ہوتا ہے جو اسکی پیدائش کے مقتضی ہوتے ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ مقدمات کسی نوعیت کے ہوں اور انکی ترتیب سے نتیجہ کچھ اور نکل آئے، کیمیاوی اجزاء کسی خاصیت کے ہوں اور انکو ملانے سے مرکب کسی اور قسم کا بن جائے، درخت لیموں کا لگایا جائے اور نشوونما پاکر وہ پھل آم کے دینے لگے، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اسباب ایک خاص نوعیت کی حکومت کے فراہم ہوں، انکے مل کر کام کرنے کا ڈھنگ بھی اسی نوعیت کی حکومت کے نشوونما کے لیے مناسب ہو، مگر ارتقائی مراحل سے گذر کر جب وہ تکمیل کے قریب پہنچے تو انہیں اسباب اور اسی عمل کے نتیجہ میں بالکل ایک دوسری ہی نوعیت کی حکومت بن جائے۔

یہ گمان نہ کیجیے کہ میں یہاں جبریت (Determinism) کو دخل دے رہا ہوں اور انسانی ارادہ و اختیار کی نفی کر رہا ہوں۔ بلاشبہ حکومت کی نوعیت متعین کرنے میں افراد اور جماعتوں کے ارادہ و عمل کا بہت بڑا حصہ ہے، مگر میں دراصل یہ ثابت کر رہا ہوں کہ جس نوعیت کا بھی نظام حکومت پیدا کرنا مقصود ہو، اسکے مزاج اور اسی کی فطرت کے مناسب اسباب فراہم کرنا اور اسی کی طرف لے جانے والا طرزِ عمل اختیار کرنا بہر حال ناگزیر ہے۔ اسکے لیے ضروری ہے کہ ویسی ہی تحریک اٹھے، اسی قسم کے انفرادی کیرکٹر تیار ہوں، اسی طرح کا اجتماعی اخلاق بنے، اسی طرز کے کارکن تربیت کیے جائیں، اسی ڈھنگ کی لیڈرشپ ہو، اور اسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جسکا اقتضاء اُس خاص نظام حکومت کی نوعیت فطرۃً کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سارے اسباب و عوامل جب بہم ہوتے ہیں اور جب ایک طویل مدت تک جدوجہد سے انکے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ انکی طیار کی ہوئی سوسائیٹی میں کسی دوسری نوعیت کے نظام حکومت کا جینا دشوار ہو جاتا ہے

تب ایک طبیعی نتیجہ کے طور پر وہ خاص نظامِ حکومت ابھر آتا ہے جسکے لیے ان طاقتور اسباب نے جد و جہد کی ہے
بالکل اسی طرح جس طرح کہ ایک بیج سے جب درخت پیدا ہوتا ہے اور اپنے زور میں بڑھتا چلا جاتا ہے تو نشو و نما
کی ایک خاص حد پر پہنچ کر اس میں وہی پھل آنے شروع ہو جاتے ہیں جنکے لیے اسکی فطری ساخت زور کر رہی تھی
اس حقیقت پر جب آپ غور کرینگے تو آپکو یہ تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہ ہوگا کہ جہاں تحریک، لیڈرشپ، انفرادی
سیرت، اجتماعی اخلاق، اور حکمتِ عملی، ہر ایک چیز ایک نوعیت کا نظام حکومت پیدا کرنے کے لیے موزوں و
مناسب ہو، اور امید یہ کی جائے کہ انکے نتیجہ میں بالکل ہی ایک دوسری نوعیت کا نظام پیدا ہوگا، وہاں بے
شعوری، خام خیالی اور خام کاری کے سوا اور کوئی چیز کام نہیں کر رہی ہے۔

اصولی حکومت

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ حکومت جسکو ہم اسلامی حکومت کہتے ہیں، اسکی نوعیت کیا ہے۔ اس
سلسلہ میں سب سے پہلی خصوصیت جو اسلامی حکومت کو تمام دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ
قومیت کا عنصر اس میں قطعی ناپید ہے۔ وہ مجرد ایک اصولی حکومت ہے۔ انگریزی میں میں اسکو Ideological state
کہونگا۔ یہ "اصولی حکومت" وہ چیز ہے جس سے دنیا ہمیشہ ناآشنا رہی ہے اور آج تک ناآشنا ہے۔ قدیم زمانہ میں
لوگ صرف خاندانوں، یا طبقوں کی حکومت سے واقف تھے۔ بعد میں نسلی اور قومی حکومتوں سے واقف ہوئے محض ایک
اصول کی حکومت، اس بنیاد پر کہ جو اس اصول کو قبول کرے وہ بلا لحاظ قومیت اسٹیٹ کو چلانے میں حصہ دار
ہوگا، دنیا کے تنگ ذہن میں کبھی نہ سما سکی۔ عیسائیت نے اس تخیل کا ایک بہت ہی دھندلا سا نقش پایا،
مگر اسکو وہ مکمل نظام فکر نہ مل سکا جسکی بنیاد پر کوئی اسٹیٹ تعمیر ہوتا۔ انقلاب فرانس میں اصولی حکومت کے
تخیل کی ایک ذرا سی جھلک انسان کی نظر کے سامنے آئی مگر نیشنلزم کی تاریکی میں گم ہوگئی۔ اشتراکیت نے
اس تخیل کا خاصا چرچا کیا، حتیٰ کہ ایک حکومت بھی اسکی بنیاد پر تعمیر کرنے کی کوشش کی، اور اس کی وجہ سے دنیا
کی سمجھ میں یہ تخیل کچھ کچھ آنے لگا تھا، مگر اسکی رگ و پے میں بھی آخر کار نیشنلزم گھس گیا۔ ابتدا سے آج تک تمام

دنیا میں صرف اسلام ہی وہ مسلک ہے جو قومیت کے ہر شائبہ سے پاک کرکے حکومت کا ایک نظام خالص آئیڈیالوجی کی بنیاد پر تعمیر کرتا ہے اور تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ اس آئیڈیالوجی کو قبول کرکے غیر قومی حکومت بنائیں۔

یہ چیز چونکہ نرالی ہے، اور گرد و پیش کی تمام دنیا اسکے خلاف چل رہی ہے اسلیے نہ صرف غیر مسلم بلکہ خود مسلمان بھی اسکو اور اسکے جملہ تضمنات (Implications) کو سمجھنے سے قاصر ہو رہے ہیں۔ جو لوگ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں مگر جنکے اجتماعی تصورات تمام تر یورپ کی تاریخ اور یورپ ہی کے سیاسیات اور علوم عمران Social sciences سے بنے ہیں، انکے ذہن کی گرفت میں یہ تصور کسی طرح نہیں آتا۔ بیرون ہند کے وہ ممالک جنکی بیشتر آبادی مسلمان اور سیاسی حیثیت سے آزاد ہے، وہاں اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں جب زمام کار آئی تو انکو حکومت کا کوئی نقشہ قومی حکومت National state کے سوا نہ سوجھا کیونکہ وہ اسلام کے علم و شعور اور اصولی حکومت کے تصور سے بالکل خالی الذہن تھے۔ ہندوستان میں بھی جن لوگوں نے اس طرز کی دماغی تربیت پائی ہے وہ اسی مشکل میں مبتلا ہیں۔ اسلامی حکومت کا نام لیتے ہیں مگر بیچارے اپنے ذہن کی ساخت سے مجبور ہیں کہ ہر پھر کر جو نقشہ بھی نظر کے سامنے آتا ہے قومی حکومت ہی کا آتا ہے، قوم پرستانہ طرز فکر Nationalistic ideology ہی میں دانستہ و نادانستہ پھنس جاتے ہیں، اور جو پروگرام سوچتے ہیں وہ بنیادی طور پر قوم پرستانہ ہی ہوتا ہے۔ انکے نزدیک پیش نظر مسئلہ کی نوعیت بس یہ ہے کہ "مسلمان" کے نام سے جو ایک "قوم" بن گئی ہے اسکے ہاتھ میں حکومت آجائے یا کم از کم اسکو سیاسی اقتدار نصیب ہو جائے۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے یہ جتنا بھی دماغ پر زور ڈالتے ہیں، اسکے سوا کوئی طریق کار انہیں نظر نہیں آتا کہ دنیا کی قومیں عموماً جو تدابیر اختیار کیا کرتی ہیں وہی اس قوم کے لیے بھی اختیار کی جائیں جن اجزاء سے یہ قوم مرکب ہے، انکو جوڑ کر ایک ٹھوس مجموعہ بنایا جائے، ان میں نیشنلزم کا جوش پھونکا جائے، انکے اندر مرکزی اقتدار ہو، انکے نیشنل گارڈس منظم ہوں، انکی ایک قومی ملیشیا تیار ہو، وہ جہاں اکثریت

میں ہوں وہاں اقتدار اکثریت (Majority-rule) کے مسلّم جمہوری اصول پر انکے قومی اسٹیٹ بنجائیں، اور جہاں انکی تعداد کم ہو وہاں اُنکے "حقوق" کا تحفظ ہوجائے، انکی انفرادیت اُسی طرح محفوظ ہو جس طرح دنیا کے ہر ملک میں ہر قومی اقلیت (National minority) اپنی انفرادیت محفوظ کرنا چاہتی ہے، ملازمتوں اور تعلیمی اور انتخابی ادارات میں انکا حصہ مقرر ہو، اپنے نمائندے یہ خود چُنیں، وزارتوں میں ایک قوم کی حیثیت سے یہ شریک کیے جائیں، وغیر ذالک من القومیات۔ یہ سب باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ امت، جماعت، ملت تاملیت، امیر، اطاعت امیر اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اسلامی اصطلاحات سے لیکر بولتے ہیں، مگر اسلامی فکر کے اعتبار سے یہ سب انکے لیے مذہب قوم پرستی کی اصطلاحوں کے مترادفات ہیں جو خوش قسمتی سے پرانے ذخیرے میں گھڑے گھڑائے مل گئے اور غیر اسلامی فکر کو چھپانے کے لیے اسلامی رنگ کے غلاف کا کام دینے لگے۔

اصولی حکومت کی نوعیت آپ سمجھ لیں تو آپکو یہ بات سمجھنے میں ذرہ برابر بھی دقت پیش نہ آئیگی کہ اسکی بنا رکھنے کے لیے یہ طرزِ فکر، یہ اندازِ تحریک، یہ عملی پروگرام نقطۂ آغاز کا بھی کام نہیں دیسکتا کجا کہ تعمیر کے انجام تک پہنچا سکے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اسکا ہر جزو ایک تیشہ ہے جس سے اصولی حکومت کے تخیل کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اصولی حکومت کے تخیل کی تو بنیاد ہی یہ ہے کہ ہمارے سامنے قومیں اور قومیتیں نہیں، صرف انسان ہیں۔ ہم اُنکے سامنے ایک اصول اس حیثیت سے پیش کرتے ہیں کہ اس پر تمدن کا نظام اور حکومت کا ڈھانچہ تعمیر کرنے میں اُن کی اپنی فلاح ہے اور جو اسکو قبول کرلے وہ اس نظام کو چلانے میں برابر کا حصہ دار ہے۔ غور کیجیے، اس تخیل کو لیکر وہ شخص کس طرح اٹھ سکتا ہے جسکے دماغ، زبان، افعال و حرکات، ہر چیز پر قومیت اور قوم پرستی کا ٹھپا لگا ہوا ہو۔ اس نے تو وسیع تر انسانیت کو اپیل کرنیکا دروازہ پہلے ہی بند کردیا پہلے ہی قدم پر اپنی پوزیشن کو آپ غلط کرکے رکھ دیا۔ قوم پرستی کے تعصب میں جو قومیں اندھی ہو رہی ہیں، جنکے لڑائی جھگڑوں کی ساری بنیاد ہی نیشنلزم اور نیشنل اسٹیٹس ہیں، انکو انسانیت کے نام پر پکارنے اور انسانی فلاح کے اصول کی طرف بلانے کا آخر یہ کونسا ڈھنگ ہے کہ ہم خود اپنے قومی حقوق کے جھگڑے اور

اپنے نیشن اسٹیٹ کے مطالبہ سے اس دعوت کی ابتدا کریں؟ کس طرح آپکی عقل یہ بات قبول کرتی ہے کہ مقدمہ بازی سے لوگوں کو روکنے کی تحریک خود ایک مقدمہ عدالت میں دائر کرنے سے شروع کی جاسکتی ہے؟

خلافت الٰہیہ

اسلامی حکومت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسکی پوری عمارت خدا کی حاکمیت کے تصور پر قائم کی گئی ہے۔ اسکا بنیادی نظریہ[1] یہ ہے کہ ملک خدا کا ہے۔ وہی اس کا حاکم ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا طبقہ یا قوم کو بلکہ پوری انسانیت کو بھی حاکمیت (Sovereignty) کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق صرف خدا کے لیے خاص ہے۔ حکومت کی صحیح شکل اسکے سوا کوئی نہیں کہ انسان خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرے، اور یہ حیثیت صحیح طور پر صرف دو صورتوں سے قائم ہو سکتی ہے: یا تو کسی انسان کے پاس براہِ راست خدا کی طرف سے قانون اور دستورِ حکومت آیا ہو، یا وہ اُس شخص کی پیروی اختیار کرے جسکے پاس خدا کی طرف سے قانون اور دستور آیا ہے۔ اِس خلافت کے کام میں تمام وہ لوگ شریک ہونگے جو اس قانون پر ایمان لائیں اور اسکی پیروی کرنے پر تیار ہوں۔ یہ کام اس احساس کے ساتھ چلایا جائیگا کہ ہم سب بحیثیت مجموعی، اور ہم میں سے ہر ایک فرداً فرداً خدا کے سامنے جوابدہ ہے، اُس خدا کے سامنے جو ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، جسکے علم سے کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی، اور جس کی گرفت سے مر کر بھی ہم نہیں چھوٹ سکتے۔ خلافت کی ذمہ داری جو ہمارے سپرد کی گئی ہے، یہ اسلیے نہیں ہے کہ ہم لوگوں پر اپنا حکم چلائیں، انکو اپنا غلام بنائیں، انکے سر اپنے آگے جھکوائیں، ان سے ٹیکس وصول کر کے اپنے محل تعمیر کریں، حاکمانہ اختیارات سے کام لیکر اپنے عیش، اپنی نفس پرستی اور اپنی کبریائی کا سامان کریں، بلکہ یہ بار ہم پر اس لیے ڈالا گیا ہے کہ ہم خدا کے قانونِ عدل کو اس کے بندوں پر جاری کریں۔ اس قانون کی

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میرا رسالہ "اسلام کا نظریہ سیاسی"۔

پابندی اور اس کے نفاذ میں ہم نے اگر ذرا سی کوتاہی بھی کی، اگر ہم نے اس کام میں ذرہ برابر بھی خود غرضی، نفس پرستی، تعصب، جانب داری یا بد دیانتی کو دخل دیا تو ہم خدا کی عدالت سے سزا پائینگے خواہ دنیا میں ہر سزا سے محفوظ رہ جائیں۔

اس نظریہ کی بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اپنی جڑ سے لیکر چھوٹی سے چھوٹی شاخوں تک ہر چیز میں دنیوی حکومتوں Secular states سے بالکل مختلف ہے۔ اسکی ترکیب، اس کا مزاج، اُسکی فطرت کوئی چیز بھی ان سے نہیں ملتی۔ اُسکو بنانے اور چلانے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنیت، خاص طرز کی سیرت اور خاص نوعیت کے کردار کی ضرورت ہے۔ اُسکی فوج، اُسکی پولیس، اُسکی عدالت، اُسکے مالیات، اُسکے قوانین، اُسکے محاصل، اُسکی انتظامی پالیسی، اُسکی خارجی سیاست، اُسکی صلح و جنگ کے معاملات، سب کے سب دنیوی ریاستوں سے مختلف ہیں۔ اِنکی عدالتوں کے جج اور چیف جسٹس اُسکی عدالت کے کلرک بلکہ چپراسی تک بننے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ اِنکی پولیس کے انسپکٹر جنرل وہاں کانسٹیبل کی جگہ کے لیے بھی موزوں نہیں ٹھیرتے۔ اِنکے جنرل اور فیلڈ مارشل وہاں سپاہیوں میں بھرتی کرنے کے قابل بھی نہیں۔ اِنکے وزرائے خارجیہ وہاں کسی منصب پر تو کیا مقرر ہونگے، شاید اپنے جھوٹ، دغا اور بد دیانتیوں کی بدولت جیل جانے سے بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ غرض وہ تمام لوگ جو اِن حکومتوں کے کاروبار چلانے کے لیے تیار کیے گئے ہوں، جنکی اخلاقی و ذہنی تربیت اِن کے مزاج کے مناسب حال کی گئی ہو، اسلامی حکومت کے لیے قطعی ناکارہ ہیں۔ اُسکو اپنے شہری، اپنے ووٹر، اپنے کونسلر، اپنے اہل کار، اپنے سپاہی، اپنے جج اور مجسٹریٹ، اپنے محکموں کے ڈائرکٹر، اپنی فوجوں کے قائد، اپنے خارجی سفراء اور اپنے وزیر، غرض اپنی اجتماعی زندگی کے تمام اجزاء، اپنی انتظامی مشین کے تمام پرزے، بالکل ایک نئی ساخت کے درکار ہیں۔ اسکو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو، جو خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں، جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں، جنکی نگاہ میں اخلاقی نفع و نقصان کا وزن دنیوی نفع و نقصان سے زیادہ ہو، جو ہر حال

میں اُس ضابطہ اور اُس طرزِ عمل کے پابند ہوں جو ان کے لیے مستقل طور پر بنا دیا گیا ہے، جنکی تمام سعی وجہد کا ہدف مقصود خدا کی رضا ہو، جن پر شخصی یا قومی اغراض کی بندگی اور ہوا و ہوس کی غلامی مسلط نہ ہو، جو تنگ نظری و تعصب سے پاک ہوں، جو مال اور حکومت کے نشے میں بدمست ہو جانے والے نہ ہوں، جو دولت کے حریص اور اقتدار کے بھوکے نہ ہوں، جنکی سیرتوں میں یہ طاقت ہو کہ جب زمین کے خزانے ان کے دستِ قدرت میں آئیں تو وہ پکے امانت دار ثابت ہوں، جب بستیوں کی حکومت ان کے ہاتھ میں آئے تو وہ راتوں کی نیند سے محروم ہو جائیں اور لوگ انکی حفاظت میں اپنی جان، مال، آبرو، ہر چیز کی طرف سے بے خوف رہیں، جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوں تو لوگوں کو ان سے قتل و غارتگری ظلم و ستم اور بدکاری و شہوت رانی کا کوئی اندیشہ نہ ہو بلکہ ان کے ہر سپاہی کو مفتوح ملک کے باشندے اپنی جان و مال اور اپنی عورتوں کی عصمت کا محافظ پائیں، جنکی دھاک بین الاقوامی سیاست میں اس درجہ کی ہو کہ انکی راستی، انصاف پسندی، اصولِ اخلاق کی پابندی اور عہد و پیمان پر تمام دنیا میں اعتماد کیا جائے۔ اِس قسم کے اور صرف اسی قسم کے لوگوں سے اسلامی حکومت بن سکتی ہے اور یہی لوگ اسکو چلا سکتے ہیں۔ رہے مادہ پرست، افادی ذہنیت (utilitarian mentality) رکھنے والے لوگ جو دنیوی فائدوں اور شخصی یا قومی مصلحتوں کی خاطر ہمیشہ ایک نیا اصول بناتے ہوں، جنکے پیشِ نظر نہ خدا ہو نہ آخرت، بلکہ جنکی ساری کوششوں کا مرکز و محور اور ساری پالیسیوں کا مدار صرف دنیوی فائدہ و نقصان ہی کا خیال ہو، تو ایسی حکومت بنانے یا چلانے کے قابل تو کیا ہونگے، ان کا اس حکومت کے دائرے میں موجود ہونا ہی ایک عمارت میں دیمک کی موجودگی کا حکم رکھتا ہے۔

اسلامی انقلاب کی سبیل

اسلامی حکومت کی اس نوعیت کو ذہن میں رکھ کر غور کیجیے کہ اس منزل تک پہنچنے کی سبیل کیا ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں، کسی سوسائٹی میں جس قسم کے فکری، اخلاقی، تمدنی اسباب و

محرکات فراہم ہوتے ہیں، انکے تعامل سے اسی قسم کی حکومت وجود میں آتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک درخت اپنی ابتدائی کونپل سے لیکر پورا درخت بننے تک تو لیموں کی حیثیت سے نشوونما پائے، مگر بارآوری کے مرحلے پر پہنچ کر یکایک آم کے پھل دینے لگے۔ اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اسکے پیدا ہونے کیلیے ناگزیر ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اٹھے جسکی بنیاد میں وہ نظریۂ حیات، وہ مقصد زندگی، وہ معیار اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اسکے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام اٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مورخ، مسلم ماہرین مالیات و معاشیات، مسلم ماہرین قانون، مسلم ماہرین سیاست، غرض ہر شعبہ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں، جن میں یہ قابلیت موجود ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کر سکیں، اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے ناخدا شناس ائمۂ فکر کے مقابلہ میں اپنی عقلی و ذہنی ریاست Intellectual leadership کا سکہ جما دیں[1]۔ اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس غلط نظام زندگی کے خلاف جدوجہد کرے جو گرد و پیش پھیلا ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں اسکے علمبردار مصیبتیں اٹھا کر، سختیاں جھیل کر قربانیاں کر کے، مار کھا کر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں، آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں اور ایسا سونا بن کر نکلیں جسکو ہر پرکھنے والا ہر طرح جانچ کر بے کھوٹ کامل العیار سونا ہی پائے، اپنی لڑائی کے دوران میں اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی اس مخصوص آئیڈیالوجی کا مظاہرہ کریں جسکے علمبردار بن کر وہ اٹھے ہیں، اور انکی ہر بات سے عیاں ہو کہ واقعی ایسے بے لوث، بے غرض، راستباز، پاک سیرت، ایثار پیشہ، با اصول، خدا ترس لوگ

---

[1] ملاحظہ ہو میرا مضمون "نیا نظام تعلیم" مندرجہ ترجمان القرآن (بابت ماہ شوال و ذی القعدہ ۵۹ھ)

انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں، اُس میں ضرور انسان کے لیے عدل اور امن ہوگا۔ اس طرح کی جدوجہد سے سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جنکی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے، اس تحریک میں کھنچ آئینگے، پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات تحریک کے مقابلہ میں دبتے چلے جائینگے، عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہوگا، اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظام حکومت کی پیاس پیدا ہو جائیگی، اور اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسرے طرز کے نظام کا چلنا مشکل ہو جائیگا۔ آخرکار ایک لازمی اور طبیعی نتیجہ کے طور پر وہی نظام حکومت قائم ہو جائیگا جسکے لیے اس طور پر زمین تیار کی گئی ہوگی، اور جونہی کہ وہ نظام قائم ہوگا، اسکو چلانے کے لیے ابتدائی اہلکاروں سے لیکر وزراء اور نظماء تک ہر درجہ کے مناسب کل پرزے اُس نظام تعلیم و تربیت کی بدولت موجود ہونگے جسکا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں۔

یہ ہے اس انقلاب کے ظہور اور اُس حکومت کی پیدائش کا فطری طریقہ جسکو اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ دنیا کے انقلابات کی تاریخ آپکے سامنے ہے۔ آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ ایک خاص نوعیت کا انقلاب اُسی نوعیت کی تحریک، اُسی نوعیت کے لیڈر اور کارکن، اور اسی نوعیت کا اجتماعی شعور اور تمدنی و اخلاقی ماحول چاہتا ہے۔ انقلاب فرانس کو وہی خاص اخلاقی و ذہنی اساس درکار تھی جو روسو، والٹیر اور مانٹسکیو جیسے لیڈروں نے تیار کی۔ انقلاب روس صرف مارکس کے افکار اور لینن اور ٹراٹسکی کی لیڈرشپ اور اُن ہزارہا اشتراکی کارکنوں ہی کی بدولت رونما ہو سکتا تھا جنکی زندگیاں اشتراکیت کے سانچے میں ڈھل چکی تھیں۔ جرمنی کا نیشنل سوشلزم اُس مخصوص اخلاقی، نفسیاتی اور تمدنی زمین ہی میں جڑ پکڑ سکتا تھا جسکو ہیگل، فشتے، گیوتے، نیٹشے اور بہت سے مفکرین کے نظریات اور ہٹلر کی لیڈرشپ نے تیار کیا۔ اسی طرح سے اسلامی انقلاب بھی صرف اسی صورت میں برپا ہو سکتا ہے جبکہ ایک عمومی تحریک قرآنی نظریات و تصورات اور محمدی سیرت و کردار کی بنیاد پر اٹھے اور اجتماعی زندگی کی ساری

ذہنی، اخلاقی، نفسیاتی اور تہذیبی بنیادوں کو طاقت ور جدوجہد سے بدل ڈالے - یہ بات کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی کہ قوم پرستانہ نوعیت کی کوئی تحریک، جسکا پس منظر یہ ناقص نظام تعلیم ہو جو اس وقت ہمارے ہاں پایا جاتا ہے، اور جسکی بنیاد افادی اخلاقیات (Utilitarian morals) اور مصلحت پرستی (Pragmatism) پر ہو، اسلامی انقلاب آخر کس طرح برپا کر سکتی ہے؟ میں اس قسم کے معجزات پر یقین نہیں رکھتا جن پر فرانس کے سابق وزیرِ اعظم موسیو رینو یقین رکھتے تھے[1] - میں تو اس کا قائل ہوں کہ جیسی تدبیر کی جائیگی ویسے ہی نتائج برآمد ہونگے -

خام خیالیاں

ہمارے ہاں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ بس مسلمانوں کی تنظیم تمام دردوں کی دوا ہے "اسلامی حکومت" یا "آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام" کے مقصد تک پہنچنے کی سبیل یہ سمجھی جا رہی ہے کہ مسلمان قوم جن افراد سے مرکب ہے وہ سب ایک مرکز پر جمع ہوں، متحد ہوں، اور ایک مرکزی قیادت کی اطاعت میں کام کریں۔ لیکن دراصل یہ قوم پرستانہ پروگرام ہے - جو قوم بھی اپنا بول بالا کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہے گی وہ یہی طریق کار اختیار کریگی خواہ وہ ہندو قوم ہو، یا سکھ، یا جرمن، یا اطالوی - قوم کے عشق میں ڈوبا ہوا ایک لیڈر جو موقع و محل کے لحاظ سے مناسب چالیں چلنے میں ماہر ہو اور جس میں حکم چلانے کی خاص قابلیت موجود ہو ہر قوم کی سربلندی کے لیے مفید ہوتا ہے، خواہ وہ موسیٰ جے یا ساورکر ہو، یا ہٹلر یا مسولینی - ایسے ہزاروں لاکھوں نوجوان جو قومی عزائم کے لیے اپنے لیڈر کی اطاعت میں منظم حرکت کر سکتے ہوں، ہر قوم کا جھنڈا بلند کر سکتے ہیں قطع نظر اس سے کہ وہ جاپانیت پر ایمان رکھتے ہوں یا چینیت پر - پس اگر "مسلمان" ایک نسلی و تاریخی قومیت کا نام ہے اور پیشِ نظر مقصد صرف اسکا بول بالا کرنا ہے تو اسکے لیے واقعی یہی سبیل ہے جو تجویز کی جا رہی ہے - اس کے

---

[1] موجودہ جنگ میں فرانس کی شکست سے چند روز پہلے موسیو رینو نے، جو اُس وقت وزیرِ اعظم تھے، ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اب فرانس کو صرف ایک معجزہ ہی بچا سکتا ہے اور میں معجزات پر یقین رکھتا ہوں"۔

نتیجہ میں ایک قومی حکومت بھی میسر آسکتی ہے اور بدرجۂ اقل وطنی حکومت میں اچھا خاصا حصہ بھی مل سکتا ہے لیکن اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کے مقصد تک پہنچنے کے لیے یہ پہلا قدم بھی نہیں بلکہ الٹا قدم ہے۔

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیرکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے رشوت، چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے۔ پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لیے جو جو تدبیریں کفار کرتے ہیں وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے موکل کی پیروی کرتے وقت اتنا ہی خدا کے خوف سے خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیر مسلم وکیل ہوتا ہے۔ ایک مسلمان رئیس دولت پاکر، ایک مسلمان عہدہ دار حکومت پاکر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیر مسلم کرتا ہے یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اسکی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کرکے ایک منظم گلّہ بنا دینا اور سیاسی تربیت سے انکو لومڑی کی ہوشیاری سکھانا، یا فوجی تربیت سے اُن میں بھیڑیے کی درندگی پیدا کرنا جنگل کی فرمانروائی حاصل کرنے کے لیے تو ضرور مفید ہو سکتا ہے، مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلائے کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کون انکی اخلاقی برتری تسلیم کریگا؟ کس کی نگاہیں انکے سامنے عزت سے جھکینگی؟ کس کے دل میں انہیں دیکھ کر اسلام کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہوگا؟ کہاں انکے "انفاسِ قدسیہ" سے یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا کا منظر دکھائی دے سکیگا؟ کس جگہ انکی روحانی امامت کا سکّہ جمیگا؟ اور زمین پر بسنے والے کہاں ان کا خیر مقدم اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے کرینگے؟ اعلائے کلمۃ اللہ جس چیز کا نام ہے اس کے لیے تو صرف اُن کارکنوں کی ضرورت ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور خدا کے قانون پر فائدہ و نقصان کی پروا کیے بغیر جمنے والے ہوں، خواہ وہ اِس نسلی مسلمان قوم میں سے ملیں یا کسی دوسری قوم سے بھرتی

ہو کر آئیں۔ ایسے دس آدمی اس مقصد کے لیے زیادہ قیمتی ہیں بہ نسبت اسکے کہ وہ انبوہ جسکا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں، ۲۵،۲۰ لاکھ یا ۵۰ لاکھ کی تعداد میں بھرتی ہو جائے۔ اسلام کو تلاش ہے کہ اُن سکّوں کا خزانہ مطلوب نہیں ہے جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہو۔ وہ سکّہ کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا ایک سکّہ اُن جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے اسکے نزدیک زیادہ قیمتی ہے ـــــ پھر جس لیڈر شپ کی اعلائے کلمتہ اللہ کے لیے ضرورت ہے، وہ ایسی لیڈر شپ ہے کہ اُن اصولوں سے ایک انچ بھی ہٹنے کے لیے تیار نہ ہو جنکا بول بالا کرنے کے لیے اسلام اٹھا ہے، خواہ اس ہٹ کی بدولت تمام مسلمان بھوکے ہی کیوں نہ مر جائیں بلکہ تہ تیغ ہی کیوں نہ کر دیے جائیں۔ ہر معاملہ میں اپنی قوم کا فائدہ تلاش کرنے والی اور اصول سے بے نیاز ہو کر ہر اُس تدبیر کو جس میں قوم کی دنیوی فلاح نظر آئے، اختیار کر لینے والی لیڈر شپ، اور وہ لیڈر شپ جس میں تقویٰ اور خدا ترسی کا رنگ مفقود ہو، اُس مقصد کے لیے قطعی ناکارہ ہے جس پر اسلام نے اپنی نظر جما رکھی ہے۔

پھر وہ نظام تعلیم و تربیت جسکی بنیاد اس مشہور مقولہ پر رکھی گئی ہے کہ "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی"، اُس اسلام کی خدمت کے لیے کس طرح موزوں ہو سکتا ہے جس کا قطعی ناقابل ترمیم فیصلہ یہ ہے کہ ہوا خواہ کسی طرف کی ہو، تم بہرحال اس راستہ پر چلو جو خدا نے تمہارے لیے معین کر دیا ہے۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ آج اگر آپکو ایک خطۂ زمین حکومت کرنے کے لیے دے بھی دیا جائے تو آپ اسلامی اصول پر اُسکا انتظام ایک دن بھی نہ چلا سکینگے۔ اسلامی حکومت کی پولیس، عدالت، فوج، مالگذاری، فینانس، تعلیمات، اور خارجی پالیسی کو چلانے کے لیے جس ذہنیت اور جس اخلاقی روح رکھنے والے آدمیوں کی ضرورت ہے، انکو فراہم کرنے کا کوئی بندوبست آپ نے نہیں کیا ہے۔ یہ تعلیم جو آپکے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جا رہی ہے، غیر اسلامی حکومت کے لیے سیکرٹری اور وزرا تک فراہم کر سکتی ہے، مگر یہ نہ ملنے۔ اسلامی عدالت کے لیے چپراسی اور اسلامی پولیس کے لیے کانسٹیبل تک فراہم نہیں کر سکتی۔ اور یہ بات جدید تعلیم ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہمارا وہ پرانا نظام

تعلیم جو حرکتِ زمین کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے، وہ بھی اس معاملہ میں اتنا ناکارہ ہے کہ اس دورِ جدید میں اسلامی حکومت کے لیے ایک قاضی، ایک وزیر مال، ایک وزیر جنگ، ایک ناظم تعلیمات اور ایک سفیر بھی مہیا نہیں کر سکتا اس تیاری پر اسلامی حکومت کا حوصلہ! سوائے اسکے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ جو لوگ یہ نام زبان پر لاتے ہیں اُنکے ذہن اسلامی حکومت کے صحیح تصور سے خالی ہیں۔

بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اسکو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اسکی بنا پر میں اسکو ناممکن سمجھتا ہوں، اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اسکو ایک معجزہ سمجھونگا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، حکومت کا نظام اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو، کسی مصنوعی تدبیر سے نظام حکومت میں کوئی مستقل تغیر پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ عمر ابن عبد العزیز جیسا زبردست فرمانروا جسکی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی، اس معاملہ میں قطعی ناکام ہو چکا ہے، کیونکہ سوسائیٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کے لیے تیار نہ تھی۔ محمد تغلق اور عالمگیر جیسے طاقتور بادشاہ اپنی شخصی دینداری کے باوجود نظام حکومت میں کوئی تغیر نہ کر سکے۔ مامون الرشید جیسا باجبروت حکمراں نظام حکومت میں نہیں صرف اسکی اوپری شکل میں خفیف سی تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس میں بھی ناکام ہوا۔ یہ اس وقت کا حال ہے جبکہ ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر تعمیر ہوگا وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جنکو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی کیرکٹر کے عاشق نہیں ہیں، اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے، تو انکے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہو کر

پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آسکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار انہی لوگوں کو ملیگا جو مردم شماری کے رجسٹر میں چاہے مسلمان ہوں، مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اُسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر، کیونکہ وہ "قومی حکومت" جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوگا، اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری و بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے، وہ "مسلم قومی حکومت" انکی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دیگی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمۃ اللہ علیہ ہی رہینگے۔ پس یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ اس قسم کی "قومی حکومت" کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہوسکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑیگی، اور اگر ہمیں یہ کام حکومت کی مدد کے بغیر، بلکہ اُس کی مزاحمت کے باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہوگا، تو ہم آج ہی سے یہ راہِ عمل کیوں نہ اختیار کریں؟ اُس نام نہاد "مسلم حکومت" کے انتظار میں اپنا وقت یا اُسکے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں جسکے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد کے لیے نہ صرف غیر مفید ہوگی بلکہ کچھ زیادہ ہی سدِ راہ ثابت ہوگی؟

اسلامی تحریک کا مخصوص طریق کار

اب میں ایک مختصر تاریخی بیان کے ذریعہ سے اس امر کی تشریح کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی انقلاب کے لیے اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے اور از سر نو تیار کرنے کی صورت کیا ہوتی ہے، اور اس جدوجہد کا وہ مخصوص طریق کار (Technique) کیا ہے جس سے یہ کامیابی کی منزل تک پہنچتی ہے۔

اسلام دراصل اُس تحریک کا نام ہے جو خدائے واحد کی حاکمیت کے نظریہ پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی بنیاد اور ایک ہی ڈھنگ پر چلی آرہی ہے۔ اسکے

لیڈر وہ لوگ تھے جنکو رُسُل اللہ (خدا کے فرستادے) کہا جاتا ہے۔ ہمیں اگر اس تحریک کو چلانا ہے تو لامحالہ انہی لیڈروں کے طرزِ عمل کی پیروی کرنی ہوگی، کیونکہ اسکے سوا کوئی اور طرزِ عمل اس خاص نوعیت کی تحریک کے لیے نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جب ہم انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم کا سراغ لگانے کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں جو انبیاء گذرے ہیں اُنکے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ قرآن میں کچھ مختصر اشارات ملتے ہیں مگر ان سے مکمل سکیم نہیں بن سکتی۔ بائیبل کے عہدِ جدید (New Testament) میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے کچھ غیر مستند اقوال بھی ملتے ہیں جن سے کسی حد تک اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی تحریک اپنے بالکل ابتدائی مرحلہ میں کس طرح چلائی جاتی ہے اور کن مسائل سے اسکو سابقہ پیش آتا ہے۔ لیکن بعد کے مراحل حضرت مسیح کو پیش ہی نہیں آئے کہ ان کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے[1]۔ اس معاملہ میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف اور مکمل رہنمائی ملتی ہے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس طرف ہمارے رجوع کرنے کی وجہ نری عقیدتمندی ہی نہیں ہے بلکہ دراصل اس راہ کے نشیب و فراز معلوم کرنے کے لیے ہم اسی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام لیڈروں میں سے صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا لیڈر ہیں جنکی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لیکر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل، دستور، داخلی و خارجی پالیسی، اور نظمِ مملکت کے نہج تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں۔ لہٰذا میں اسی ماخذ سے اس تحریک کے طریق کار کا ایک مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے ہیں تو آپکو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے

[1] چونکہ مسیح علیہ السلام کا طریق تعلیم و تربیت بھی اس تحریک کے ابتدائی مرحلہ کو سمجھنے کے لیے مفید ہے اسلیے انجیل متی و لوقا کے چند اقتباسات اس مضمون کے ضمیمہ کے طور پر آخر میں درج کر دیے گئے ہیں۔

اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رومی اور ایرانی امپیریلزم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیاز بھی تھے۔ ناجائز معاشی استفاع (Economic Exploitation) بھی ہو رہا تھا۔ اخلاقی ذمائم بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپکے اپنے ملک میں بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے جو ایک لیڈر کے ناخن تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، افلاس، طوائف الملوکی، اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ یمن تک عرب کے تمام ساحلی علاقے عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی تسلط میں تھے۔ شمال میں عین حجاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گروہ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی سودخواری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مشرقی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکّہ پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اسکے ہم مذہب اور اس سے ایک گونہ معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھا خود حجاز اور یمن کے درمیان نجران کے مقام پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر جس لیڈر کو اللہ نے رہنمائی کے لیے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف بھی توجہ نہ کی بلکہ دعوت اس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الٰہوں کو چھوڑ دو اور صرف اُسی ایک الٰہ کی بندگی قبول کرو۔

اسکی وجہ یہ نہ تھی کہ اُس رہنما کی نگاہ میں دوسرے مسائل کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے یا وہ کسی توجہ کے لائق ہی نہ تھے۔ آپکو معلوم ہی ہے کہ آگے چل کر اُس نے ان سب مسئلوں کی طرف توجہ کی اور سب کو ایک ایک کر کے حل کیا۔ مگر ابتدا میں سب طرف سے نظر پھیر کر اسی ایک چیز پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے انسان کی اخلاقی و تمدنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان سب کی بنیادی علت انسان کا اپنے آپکو خود مختار (independent) اور غیر ذمہ دار (Irresponsible) سمجھنا، بالفاظ دیگر آپ اپنا الٰہ بننا ہے، یا پھر یہ ہے کہ وہ الٰہ العالمین کے سوا کسی دوسرے کو صاحب امر تسلیم کرے، خواہ وہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ چیز جب تک جڑ میں موجود ہے اسلامی نظریہ کی

رو سے کوئی اوپری اصلاح، انفرادی بگاڑ یا اجتماعی خرابیوں کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی ایک طرف سے خرابی کو دور کیا جائیگا اور کسی دوسری طرف سے وہ سر نکال لیگی۔ لہذا اصلاح کا آغاز اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی چیز سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خود مختاری کی ہوا کو نکالا جائے اور اسے بتایا جائے کہ تو جس دنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے بادشاہ کی سلطنت نہیں ہے، بلکہ فی الواقع اس کا ایک بادشاہ موجود ہے، اور اسکی بادشاہی نہ تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے، نہ تیرے مٹائے سے مٹ سکتی ہے، نہ تو اس کے حدود سلطنت سے نکل کر کہیں جا سکتا ہے۔ اس امٹ اور اٹل واقعہ کی موجودگی میں تیرا خود مختاری کا زعم ایک احمقانہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان لامحالہ تیرے ہی اوپر عائد ہوگا۔ عقل اور حقیقت پسندی (Realism) کا تقاضا یہ ہے کہ سیدھی طرح اسکے حکم کے آگے سر جھکا دے اور مطیع بندہ بنکر رہ۔ دوسری طرف اس کو واقعہ کا یہ پہلو بھی دکھا دیا جائے کہ اس پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ، ایک ہی مالک اور ایک ہی مختار کار ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ واقع میں کسی کا حکم چلتا ہے۔ اسلیے تو اسکے سوا کسی کا بندہ نہ بن۔ کسی کا حکم نہ مان۔ کسی کے آگے سر نہ جھکا۔ یہاں کوئی ہز میجسٹی نہیں ہے۔ میجسٹی اسی ایک کے لیے مختص ہے۔ یہاں کوئی ہز ہائی نس نہیں ہے۔ ہائی نس صرف ایک ہی کو زیبا ہے۔ یہاں کوئی ہز ہولی نس نہیں ہے۔ ہولی نس ساری کی ساری اسی ایک کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہز لارڈ شپ نہیں ہے۔ لارڈ شپ بالکلیہ اسی ایک کا حصہ ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز (Law-giver) نہیں ہے۔ قانون اسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حق دار سزاوار ہے۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی ان داتا، کوئی راجہ یا مہاراجہ، کوئی ولی و کارساز کوئی دعائیں سننے والا اور فریاد رس نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی کنجیاں نہیں ہیں۔ کسی کو برتری و فوقیت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب بندگی بندے ہیں۔ رب اور مولیٰ صرف ایک ہے۔ لہذا تو ہر غلامی، ہر اطاعت، ہر پابندی سے انکار کر دے اور اُسی ایک کا غلام، مطیع اور

پابندِ حکم بن جا۔ یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت اُدھڑ کر از سرِ نو ایک نئے نقشہ پر بنتی ہے اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدم سے لیکر اب تک پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہونگے، اسی بنیاد پر ایک نئے طریقہ سے حل ہوتے ہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی کارروائی کے براہِ راست پیش کر دیا۔ اُنہوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہ کیا کہ پہلے کچھ سیاسی یا سوشل طرز کا کام کر کے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے، پھر اس اثر سے کام لیکر کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کیے جائیں، پھران اختیارات سے کام لیکر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلاتے ہوئے اس مقام تک بڑھا لائیں۔ یہ سب کچھ، کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اٹھا اور چھوٹتے ہی اس نے لا الٰہ الا اللہ کا اعلان کر دیا۔ اس سے کم کسی چیز پر اسکی نظر ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ٹھیری۔ اسکی وجہ محض پیغمبرانہ جرأت اور تبلیغی جوش نہیں ہے۔ دراصل اسلامی تحریک کا طریقِ کار ہی یہی ہے۔ وہ اثر یا وہ نفوذ و اقتدار جو دوسرے ذرائع سے پیدا کیا جائے، اس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں ہوتا۔ جو لوگ لا الٰہ الا اللہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آپ کا ساتھ دیتے رہے ہیں، وہ اس بنیاد پر تعمیرِ جدید کرنے میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتے۔ اس کام میں تو وہی لوگ مفید ہو سکتے ہیں جو آپکی طرف لا الٰہ الا اللہ کی آواز سن کر ہی آئیں، اسی چیز میں انکے لیے کشش ہو، اسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں، اور اسی اساس پر وہ کام کرنے کے لیے اٹھیں لہٰذا اسلامی تحریک کو چلانے کے لیے جس خاص قسم کے تدبر اور حکمتِ عملی کی ضرورت ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز اسی دعوتِ توحید سے کیا جائے۔

توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری، یا غیر اللہ کی حاکمیت و الوہیت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا آپکے موذنوں کو اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

کی صدا بلند کرتے ہوئے اسیلیے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہو نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنی اور کوئی مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے، اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرمانروا نہیں ہے، کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا، کسی قانون کو میں نہیں مانتا، کسی عدالت کے حدود و اختیارات (Jurisdiction) مجھ تک نہیں پہنچتے، کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے، کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں، کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا، ایک اللہ کے سوا میں سب سے باغی اور سب سے منحرف ہوں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں، دنیا خود آپ سے لڑنے آ جائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکایک زمین و آسمان آپکے دشمن ہو گئے ہیں، اور ہر طرف آپکے لیے سانپ، بچھو اور درندے ہی درندے ہیں۔

یہی صورت اُسوقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا، اور سننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے، اسیلیے جس جس پر جس پہلو سے بھی اس پکار کی ضرب پڑتی تھی وہ اس آواز کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں کو اپنی برہمنیت و پاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا، نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوق (Racial Superiority) کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقہ کا، غرض ہر بت کے پرستار کو اپنے بُت کے ٹوٹنے کا خطرہ اسی ایک آواز میں محسوس ہوا، اسیلیے الکفر ملۃ واحدۃ، وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے، اس نئی تحریک سے لڑنے کے لیے ایک ہو گئے۔ اس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے جنکا ذہن صاف تھا، جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد اور رکھتے تھے، جنکے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق

یہ ہے تو اسکی خاطر آگ میں کودنے اور موت سے کھیلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ایسے ہی لوگوں کی اس تحریک کے لیے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک دو دو چار چار کر کے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی۔ کسی کا روزگار چھوٹا۔ کسی کو گھر والوں نے نکال دیا۔ کسی کے عزیز، دوست، آشنا سب چھوٹ گئے۔ کسی پر مار پڑی، کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سر بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔ کسی کو عورت، مال، حکومت و ریاست اور ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب چیزیں آئیں، ان کا آنا ضروری تھا، ان کے بغیر اسلامی تحریک نہ مستحکم ہو سکتی تھی اور نہ بڑھ سکتی تھی۔

ان کا پہلا فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے کچے کیرکٹر اور ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اس طرف آ ہی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسلِ آدم کا بہترین جوہر تھا جسکی دراصل ضرورت تھی۔ کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اسکے سوا نہ تھی کہ جو بھی آئے وہ اس بھٹی میں سے گذر کر آئے۔

پھر جو لوگ آئے انکو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے، یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لیے مصائب کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا، بلکہ صرف حق اور صداقت کے لیے، خدا اور اسکی رضا کے لیے۔ اسی کے لیے وہ پٹے، اسی کے لیے بھوکے مرے، اسی کے لیے دنیا بھر کی جفاکاریوں کا تختۂ مشق بنے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی گئی جسکی ضرورت تھی۔ ان کے اندر خالص اسلامی کیرکٹر پیدا ہوا۔ انکی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اس زبردست تربیت گاہ میں کیفیت اسلامی کا طاری ہونا ایک طبیعی امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اٹھتا ہے اور اسکی راہ میں کشمکش، جد و جہد، مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار، قید، فاقہ، جلاوطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گذرتا ہے تو اس ذاتی تجربہ کی بدولت اُس مقصد کی تمام کیفیات اُسکے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں اور اسکی پوری شخصیت اس مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے

اس چیز کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے نماز اُن پر فرض کی گئی تاکہ نظری پراگندگی کا ہر امکان دور ہو جائے۔ اپنے نصب العین پر انکی نگاہ جمی رہے۔ جسکو وہ حاکم مان رہے ہیں اسکی حاکمیت کا بار بار اقرار کر کے اپنے عقیدہ میں مضبوط ہو جائیں۔ جسکے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا میں کام کرنا ہے اس کا عالم الغیب والشہادہ ہونا، اس کا مالک یوم الدین ہونا، اس کا قاہر فوق عبادہ ہونا پوری طرح انکے ذہن نشین ہو جائے اور کسی حال میں اسکی اطاعت کے سوا دوسرے کی اطاعت کا خیال تک انکے دل میں نہ آنے پائے۔

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اس طرح ہو رہی تھی۔ اور دوسری طرف اسی کشمکش کی وجہ سے اسلامی تحریک پھیل بھی رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند انسان پیٹے جا رہے ہیں، قید کیے جا رہے ہیں، گھروں سے نکالے جا رہے ہیں، تو خواہ مخواہ انکے اندر یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، زر، زمین کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے، کوئی انکی ذاتی غرض نہیں ہے، یہ اللہ کے بندے صرف اسلیے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت ان پر منکشف ہوئی ہے، تو انکے دلوں میں آپ سے آپ یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اُس چیز کو معلوم کریں، آخر ایسی کیا چیز ہے جسکے لیے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں؟ پھر جب انہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیز ہے لا الٰہ الا اللہ، اور اس سے انسانی زندگی میں اس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے، اور اس دعوت کو لیکر ایسے لوگ اٹھے ہیں جو محض صداقت و حقیقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں اور جان، مال، اولاد، ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں تو انکی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ انکے دلوں پر جتنے پردے پڑے ہوئے تھے وہ چاک ہونے لگتے تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ یہ سچائی تیر کی طرح نشانے پر جا کر بیٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بجز اُن لوگوں کے جنکو ذاتی وجاہت کے تکبر، یا اجداد پرستی کی جہالت، یا اغراض دنیوی کی محبت نے اندھا بنا رکھا تھا اور سب لوگ اس تحریک کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ کوئی جلدی کھنچا اور کوئی زیادہ دیر تک اس کشش کی مزاحمت کرتا رہا، مگر دیر یا سویر ہر صداقت پسند بے لوث آدمی کو اسکی طرف کھنچنا ہی پڑا۔

اس دوران میں تحریک کے لیڈر نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اصولوں کا اور ہر اس چیز کا جسکے لیے یہ تحریک اٹھی تھی، پورا پورا مظاہرہ کیا۔ انکی ہر بات، ہر فعل، اور ہر حرکت سے اسلام کی روح ٹپکتی تھی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑی تفصیل طلب بحث ہے جسکی تشریح کا یہاں موقع نہیں۔ مگر مختصراً چند نمایاں باتوں کا میں یہاں ذکر کرونگا۔

انکی بیوی حضرت خدیجہ حجاز کی سب سے زیادہ مالدار عورت تھیں اور وہ انکے مال سے تجارت کرتے تھے۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو آنحضرت کا سارا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہو جانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لینے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا۔ جو کچھ پچھلا اندوختہ تھا اسکو میاں اور بیوی دونوں نے اس تحریک کے پھیلانے پر چند سال میں لٹا دیا۔ آخر کار نوبت یہاں تک آئی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی حجاز کا ملک التجار تھا، اسکو سواری کے لیے ایک گدھا تک میسر نہ ہوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرت کے سامنے حجاز کی حکومت کا تخت پیش کیا۔ کہا کہ ہم آپکو اپنا بادشاہ بنا لینگے، عرب کی حسین ترین عورت آپکے نکاح میں دینگے، دولت کے ڈھیر آپکے قدموں میں لگا دینگے بشرطیکہ آپ اس تحریک سے باز آجائیں۔ مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لیے اٹھا تھا، اس نے ان سب پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہو گیا۔

قریش کے اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمد! ہم تمہارے پاس کیسے آکر بیٹھیں اور تمہاری باتیں کیسے سنیں جبکہ تمہاری مجلس میں ہر وقت غلام، مفلس، معاذ اللہ کمین لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو سب سے زیادہ نیچے طبقہ کے لوگ ہیں انکو تم نے اپنے گرد و پیش جمع کر رکھا ہے۔ انہیں ہٹاؤ تو ہم تم سے ملیں۔ مگر وہ شخص جو انسانی کی اونچ نیچ برابر کرنے آیا تھا اس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلے، اپنے خاندان، کسی کے مفاد کی کبھی پروا نہیں کی۔ اسی چیز نے دنیا کو یقین دلایا کہ آپ انسان، بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اٹھے ہیں، اور اسی چیز نے آپکی دعوت کی طرف ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر ہاشمیوں کو اس فکر سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپ اس بات کے لیے کبھی بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو تو کسی طرح بچالوں، تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپ عرب کی برتری کے لیے اٹھتے تو حبش کے بلال، روم کے صہیب اور فارس کے سلمان کو کیا غرض تھی کہ اس کام میں آپکا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی جو ہر ذاتی، خاندانی، قومی، وطنی غرض سے مکمل بے لوث تھی۔

مکہ سے جب آپکو ہجرت کرنی پڑی تو وہ تمام امانتیں جو دشمنوں نے آپکے پاس رکھوائی تھیں، حضرت علی کے سپرد کر کے نکلے کہ میرے بعد ہر ایک کی امانت اسکو پہنچا دینا۔ دنیا پرست ایسے موقع پر جو کچھ ہاتھ لگتا ہے لیکر چلتے ہیں۔ مگر خدا پرست نے اپنی جان کے دشمنوں، اپنے خون کے پیاسوں کا مال بھی انہیں واپس پہنچانے کی فکر کی اور اس وقت کی جبکہ وہ اسکے قتل کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ وہ اخلاق تھا جسکو دیکھ کر عرب کے لوگ دنگ رہ گئے ہونگے اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ دو سال بعد بدر کے میدان میں آنحضرت کے خلاف لڑنے کھڑے ہوئے ہونگے تو انکے دل اندر سے کہہ رہے ہونگے کہ یہ تم کس سے لڑ رہے ہو؟ اس فرشتہ خصلت انسان سے جو قتل گاہ سے رخصت ہوتے وقت بھی انسانوں کے حقوق اور امانت کی ذمہ داری کو نہیں بھولتا؟ اسوقت انکے ہاتھ ضد کی بنا پر لڑتے ہونگے مگر انکے دل اندر سے بھنچ رہے ہونگے۔ عجب نہیں کہ بدر میں کفار کی شکست کے اخلاقی اسباب میں سے یہ بھی ایک سبب ہو۔

۱۳ برس کی شدید جدوجہد کے بعد وہ وقت آیا جب مدینہ میں اسلام کا ایک چھوٹا سا اسٹیٹ قائم کرنے کی نوبت آئی۔ اس وقت ڈھائی تین سو کی تعداد میں ایسے آدمی فراہم ہو چکے تھے جن میں سے ایک ایک

اسلام کی پوری تربیت پاکر اس قابل ہو چکا تھا کہ جس حیثیت میں بھی اسکو کام کرنیکا موقع ملے مسلمان کی حیثیت سے اسکو انجام دے سکے - اب یہ لوگ ایک اسلامی اسٹیٹ کو چلانے کے لیے تیار تھے، چنانچہ وہ قائم کر دیا گیا - دس برس تک رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور اس مختصر سی مدت میں ہر شعبۂ حکومت کو اسلامی طرز پر چلانے کی پوری مشق ان لوگوں کو کرا دی - یہ دور اسلامی آئیڈیالوجی کے ایک مجرد تخیل (Abstract idea) سے ترقی کرکے ایک مکمل نظام تمدن بننے کا دور ہے جس میں اسلام کی انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی، جنگی، بین الاقوامی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح ہوا، ہر شعبۂ زندگی کے لیے اصول بنے، ان اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کیا گیا، اس خاص طرز پر کام کرنے والے کارکن تعلیم اور تربیت اور عملی تجربہ سے تیار کیے گئے، اور ان لوگوں نے اسلام کی حکمرانی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں مدینہ جیسے ایک چھوٹے سے قصبہ کا اسٹیٹ پورے عرب کی سلطنت میں تبدیل ہو گیا - جوں جوں لوگ اسلام کو اسکی عملی صورت میں اور اسکے نتائج کو محسوس شکل میں دیکھتے تھے، خود بخود اس بات کے قائل ہوتے جاتے تھے کہ فی الواقع انسانیت اسی کا نام ہے اور انسانی فلاح اسی چیز میں ہے - بدترین دشمنوں کو بھی آخر قائل ہو کر اسی مسلک کو قبول کرنا پڑا جسکے خلاف وہ برسوں تک لڑتے رہے تھے - خالد بن ولید قائل ہوئے، ابوجہل کے بیٹے عکرمہ قائل ہوئے، ابوسفیان قائل ہوئے، قاتلِ حمزہ وحشی قائل ہوئے، ہندہ جگر خوار تک کو آخر کار اس شخص کی صداقت کے آگے سر تسلیم خم کر دینا پڑا جس سے بڑھ کر اسکی نگاہ میں کبھی کوئی مبغوض نہ تھا۔

غلطی سے تاریخ نگاروں نے غزوات کو اتنا زیادہ نمایاں کر دیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں عرب کا یہ انقلاب لڑائیوں سے ہوا - حالانکہ ۸ سال کی تمام لڑائیوں میں، جن سے عرب جیسی جنگجو قوم مسخر ہوئی، طرفین کے جانی نقصانات کی تعداد ہزار بارہ سو سے زیادہ نہیں ہے - انقلابات کی تاریخ اگر آپکے پیش نظر ہے تو آپکو تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ انقلاب غیر خونی انقلاب (Bloodless revolution) کہے جانے کا مستحق ہے - پھر اس انقلاب

میں فقط ملک کا طریق انتظام ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ ذہنیتیں بدل گئیں، نگاہ کا زاویہ بدل گیا، سوچنے کا طریقہ بدل گیا، زندگی کا طرز بدل گیا، اخلاق کی دنیا بدل گئی، عادات اور خصائل بدل گئے، غرض ایک پوری قوم کی کایا پلٹ کر رہ گئی - جو زانی تھے وہ عورتوں کی عصمت کے محافظ بن گئے - جو شرابی تھے وہ منع شراب کی تحریک کے علمبردار بن گئے - جو چور اور اچکے تھے اُن کا احساس دیانت اتنا نازک ہو گیا کہ دوستوں کے گھر کھانا کھانے میں بھی انکو اس بنا پر تامل تھا کہ مبادا ناجائز طریقہ پر مال کھانے کا اطلاق اس فعل پر بھی نہ ہو جائے، حتی کہ قرآن میں خود اللہ تعالیٰ کو انہیں اطمینان دلانا پڑا کہ اس طرح کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں جو ڈاکو اور لٹیرے تھے وہ اتنے متدین بن گئے کہ انکے ایک معمولی سپاہی کو پایۂ تخت ایران کی فتح کے موقع پر کروڑوں کی قیمت کا شاہی تاج ہاتھ لگا اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے پیوند لگے ہوئے کمبل میں اسے چھپا کر سپہ سالار کے حوالہ کرنے کے لیے پہنچا تاکہ اس غیر معمولی واقعہ سے اسکی دیانت کی شہرت نہ ہو جائے اور اسکے خلوص پر ریاکاری کا میل نہ آجائے - وہ جنکی نگاہ میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، جو اپنی بیٹیوں کو آپ اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کرتے تھے، انکے اندر جان کا اتنا احترام پیدا ہو گیا کہ کسی مرغ کو بھی بے رحمی سے قتل ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے - وہ جنکو راست بازی اور انصاف کی ہوا تک نہ لگی تھی انکے عدل اور راستی کا یہ حال ہو گیا کہ خیبر کی صلح کے بعد جب انکا تحصیلدار یہودیوں سے سرکاری معاملہ وصول کرنے گیا تو یہودیوں نے اسکو پیش قرار رقم اس غرض کے لیے پیش کی کہ وہ سرکاری مطالبہ میں کچھ کمی کر دے، مگر اس نے رشوت لینے سے انکار کر دیا اور حکومت اور یہودیوں کے درمیان پیداوار کا آدھا حصہ اس طرح تقسیم کیا کہ دو برابر کے ڈھیر آمنے سامنے لگا دیئے اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے جس ڈھیر کو چاہیں اٹھا لیں - اس نرالی قسم کے تحصیلدار کا یہ طرز عمل دیکھ کر یہودی انگشت بدنداں رہ گئے اور بے اختیار انکی زبانوں سے نکلا کہ اسی عدل پر زمین و آسمان قائم ہیں - ان کے اندر وہ گورنر پیدا ہوئے جو گورنمنٹ ہاؤسوں میں نہیں بلکہ رعایا کے درمیان انہی جیسے گھروں میں رہتے

تھے، بازاروں میں پیدل پھرتے تھے، دروازوں پر دربان تک نہ رکھتے تھے، رات دن میں ہر وقت جو چاہتا تھا ان سے انٹرویو کر سکتا تھا۔ انکے اندر وہ قاضی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے ایک یہودی کے خلاف خود خلیفہ وقت کا دعویٰ اس بنا پر خارج کر دیا کہ خلیفہ اپنے غلام اور اپنے بیٹے کے سوا کوئی گواہ پیش نہ کر سکا۔ انکے اندر وہ سپہ سالار پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے دوران جنگ میں ایک شہر خالی کرتے وقت پورا جزیہ یہ کہکر اہل شہر کو واپس دے دیا کہ ہم اب تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں، لہٰذا جو ٹیکس ہم نے حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے رکھنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ اُن میں وہ سفیر پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے سپہ سالار ایران کے بھرے دربار میں اسلام کے اصول مساوات انسانی کا ایسا مظاہرہ کیا اور ایران کے طبقاتی امتیازات پر ایسی برمحل تنقید کی کہ خدا جانے کتنے ایرانی سپاہیوں کے دلوں میں اس مذہب انسانیت کی عزت و وقعت کا بیج اُسی وقت پڑ گیا ہوگا۔ ان میں وہ شہری پیدا ہوئے جنکے اندر اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا زبردست تھا کہ جن جرائم کی سزا ہاتھ کاٹنے اور پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی صورت میں دی جاتی تھی انکا اقبال خود آکر کرتے تھے اور تقاضا کرتے تھے کہ سزا دے کر انہیں گناہ سے پاک کر دیا جائے تاکہ وہ چور یا زانی کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں نہ پیش ہوں۔ ان میں وہ سپاہی پیدا ہوئے جو تنخواہ لیکر نہیں لڑتے تھے بلکہ اُس مسلک کی خاطر جس پر وہ ایمان لائے تھے، اپنے خرچ سے میدان جنگ میں جاتے اور پھر جو مالِ غنیمت ہاتھ لگتا وہ سارا کا سارا لاکر سپہ سالار کے سامنے رکھدیتے۔ کیا اجتماعی اخلاق اور اجتماعی ذہنیت کا اتنا زبردست تغیر محض لڑائیوں کے زور سے ہو سکتا تھا؟ تاریخ آپکے سامنے موجود ہے۔ کہیں آپکو ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ تلوار نے انسانوں کو اس طرح مکمل طور پر بدل ڈالا ہو؟

درحقیقت یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ۱۳ برس کی مدت میں تو کل ڈھائی تین سو مسلمان پیدا ہوئے مگر بعد کے دس سال میں سارا کا سارا ملک مسلمان ہو گیا۔ اس معمے کو لوگ حل نہیں کر سکتے اس لیے عجیب عجیب توجیہیں کرتے ہیں۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے۔ جب تک اس نئی آئیڈیالوجی پر زندگی

کا نقشہ نہیں بنا تھا، لوگوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ نرالی قسم کا لیڈر آخر کیا بنانا چاہتا ہے۔ طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا ہوتے تھے۔ کوئی کہتا یہ نری شاعرانہ باتیں ہیں۔ کوئی اسے محض زبان کی ساحری قرار دیتا۔ کوئی کہتا کہ یہ شخص مجنون ہو گیا ہے۔ اور کوئی اسے محض ایک خیالی آدمی (Visionary) قرار دیکر گویا اپنے نزدیک رائےزنی کا حق ادا کر دیتا۔ اُس وقت صرف غیر معمولی سمجھ اور ذہانت رکھنے والے لوگ ہی ایمان لائے جنکی نگاہِ حقیقت بیں اس نئے مسلک میں انسانی فلاح کی صورت صاف دیکھ سکتی تھی۔ مگر جب اِس نظامِ فکر پر ایک مکمل نظامِ حیات بنگیا اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس کو کام کرتے ہوئے دیکھ لیا اور اسکے نتائج انکے سامنے عیاناً آ گئے تب انکی سمجھ میں آیا کہ یہ وہ چیز تھی جسکو بنانے کے لیے وہ اللہ کا نیک بندہ دنیا بھر کے ظلم سہہ رہا تھا۔ اسکے بعد ضد اور ہٹ دھرمی کے لیے پاؤں جمانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ جسکی پیشانی پر بھی دو آنکھیں تھیں اور ان آنکھوں میں نور تھا اسکے لیے آنکھوں دیکھی حقیقت سے انکار کرنا غیر ممکن ہو گیا۔

یہ ہے اس اجتماعی انقلاب کے لانے کا طریقہ جسکو اسلام برپا کرنا چاہتا ہے۔ یہی اس کا راستہ ہے۔ اسی ڈھنگ پر وہ شروع ہوتا ہے، اور اسی تدریج سے وہ آگے بڑھتا ہے۔ لوگ اسکو معجزہ کی قسم کا واقعہ سمجھ کر کہدیتے ہیں کہ اب یہ کہاں ہو سکتا ہے، نبی ہی آئے تو یہ کام ہو۔ مگر تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ بالکل ایک طبیعی قسم کا واقعہ ہے۔ اس میں علت اور معلول کا پورا منطقی اور سائنٹفک ربط ہمیں نظر آتا ہے۔ آج بھی ہم اس ڈھنگ پر کام کریں تو وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس کام کے لیے ایمان، شعورِ اسلامی، ذہن کی یکسوئی، مضبوط قوتِ فیصلہ، اور شخصی جذبات اور ذاتی امنگوں کی سخت قربانی درکار ہے۔ اس کے لیے ان جوان ہمت لوگوں کی ضرورت ہے جو حق پر ایمان لانے کے بعد اس پر پوری طرح نظر جما دیں، کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کریں، دنیا میں خواہ کچھ ہوا کرے، وہ اپنے نصب العین کے راستے سے ایک انچ نہ ہٹیں، دنیوی زندگی میں اپنی ذاتی ترقی کے سارے امکانات

کو قربان کردیں، اپنی امیدوں کا اور اپنے والدین کی تمناؤں کا خون کرتے ہوئے نہ جھجکیں، عزیزوں اور دوستوں کے چھوٹ جانے کا غم نہ کریں، سوسائیٹی، حکومت، قانون، قوم، وطن جو چیز بھی انکے نصب العین کی راہ میں حائل ہو اس سے لڑ جائیں۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا کلمہ بلند کیا تھا، ایسے ہی لوگ آج بھی کرینگے، اور یہ کام ایسے ہی لوگوں کے کیے سے ہو سکتا ہے۔

استدراک - اوپر کے مضمون میں اسلامی انقلاب کے طریق کار کی جو توضیح کی گئی ہے، اگرچہ وہ بجائے خود کافی ہے، لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسیح علیہ السلام کے چند اقوال ایک خاص ترتیب کے ساتھ نقل کر دیے جائیں جن سے اس تحریک کے ابتدائی مرحلہ پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔ چونکہ ہمارے موجودہ زمانے کے حالات اُن حالات سے بہت ملتے جلتے ہیں جن میں سیدنا مسیحؑ نے اہلِ فلسطین کو حکومت الٰہیہ کی دعوت دی تھی اس لیے اُنکے طریق عمل میں ہم کو مفید ہدایات مل سکتی ہیں:-

"فقیہوں میں سے ایک نے . . . اُس سے پوچھا کہ سب حکموں میں اول کونسا ہے۔ یسوع نے جواب دیا کہ اول یہ ہے، اے اسرائیل سُن، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند[1] ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ۔ . . . . . فقیہ نے اس سے کہا اے اُستاد، کیا خوب! تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں" (مرقس ۱۲: ۲۸ - ۳۲)

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر" (لوقا ۴: ۸)

"پس تم اس طرح دعا مانگا کرو کہ اے ہمارے باپ! تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے

[1] "خداوند" اور "الٰہ" دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔

زمین پر بھی ہو" (متی ۶ : ۹ - ۱۰)

اس آیت میں حضرت مسیح نے اپنے نصب العین کو واضح کر دیا ہے - یہ جو عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ خدا کی بادشاہت سے انکی مراد محض روحانی بادشاہت تھی، یہ آیت اسکی تردید کرتی ہے - انکا صاف مقصد یہ تھا کہ زمین پر خدا کا قانون اور اس کا حکم شرعی اسی طرح جاری ہو جس طرح تمام کائنات میں اسکا قانون طبیعی نافذ ہے سیاسی انقلاب کے لیے وہ لوگوں کو تیار کر رہے تھے ۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں - صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں - میں اسلیے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اسکی ماں سے اور بہو کو اسکی ساس سے جدا کر دوں - اور آدمی کے دشمن اسکے گھر ہی کے لوگ ہونگے - جو کوئی باپ ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں - اور جو کوئی اپنی صلیب[1] نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں - جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئیگا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائیگا" (متی ۱۰ : ۳۴ - ۳۹)

"جو کوئی میرے پیچھے آنا چاہے وہ اپنی خودی[2] سے انکار کرے اور اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہو لے" (متی ۱۶ : ۲۴)

"بھائی کو بھائی قتل کے لیے حوالہ کریگا اور بیٹے کو باپ - اور بیٹے اپنے ماں باپ کے خلاف کھڑے ہو کر انہیں مروا ڈالینگے - اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کرینگے مگر جو آخر تک برداشت کریگا وہی نجات پائیگا (متی ۱۰ : ۲۱ - ۲۲)

"دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑوں کو بھیڑیوں کے بیچ میں . . . . آدمیوں سے خبردار

---

[1] اپنی صلیب اٹھانے سے مراد سزائے موت کے لیے تیار رہنا ہے۔ جسطرح اردو میں محاورہ ہے سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلنا

[2] اس سے مراد ہے خود پرستی اور اغراض ذاتی سے دست بردار ہو جانا ۔

رہو کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالہ کرینگے اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے مارینگے اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کیے جاؤگے" (متی ۱۰: ۱۶-۱۸)

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے[۱] تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تم میں ایسا کون ہے کہ جب وہ ایک برج بنانا چاہے تو پہلے بیٹھ کر لاگت کا حساب نہ کرے کہ آیا میرے پاس اسکے تیار کرنے کا سامان ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب نیو ڈال کر تیار نہ کر سکے تو سب دیکھنے والے یہ کہہ کر اس پر ہنسنا شروع کریں کہ اس شخص نے عمارت بنانی شروع تو کی مگر تیار نہ کر سکا۔۔۔ تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کردے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا" (لوقا ۱۴: ۲۶-۳۳)

یہ تمام آیات صاف دلالت کرتی ہیں کہ مسیح علیہ السلام محض ایک دھرم کا پرچار کرنے نہیں اٹھے تھے بلکہ پورے نظام تمدن و سیاست کو بدل دینا انکے پیش نظر تھا جس میں رومی سلطنت، یہودی ریاست، فقیہوں اور فریسیوں کے اقتدار، اور فی الجملہ تمام بندگانِ نفس و ہوائے نفس سے جنگ کا خطرہ تھا۔ اسی لیے وہ لوگوں کو کھلے الفاظ میں بتا دیتے تھے کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں وہ نہایت خطرناک ہے اور میرے ساتھ اسی کو آنا چاہیے جو اِن تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔

"شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اسکی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کُرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھ کو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا" (متی ۵: ۳۹-۴۱)

[۱] دشمنی کرنے سے مراد انکی محبت اور انکے مفاد کو اسلامی تحریک پر قربان کر دینا ہے۔

"جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور روح کو قتل نہیں کر سکتے اُن سے نہ ڈرو بلکہ اس سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے۔" (متی ۱۰: ۲۸)

"اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں، بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع کرو۔" (متی ۶: ۱۹ - ۲۰)

کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی جان کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائینگے، یا کیا پئینگے، اور نہ بدن کی کہ کیا پہنینگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں پھر بھی تمہارا آسمانی باپ انکو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کرکے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں۔ پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت کے ان میں سے کسی کے مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائیگی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو! تم کو کیوں نہ پہنائیگا؟

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم پہلے اُسکی بادشاہت اور اسکی راست بازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائینگی۔" (متی ۶: ۲۴ - ۳۳)

"مانگو تو تمہیں دیا جائیگا۔ ڈھونڈو تو پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائیگا۔" (متی ۷: ۷)

عام غلط فہمی ہے کہ سیدنا مسیح نے رہبانیت اور ترک و تجرید کی تعلیم دی ہے۔ حالانکہ اس

انقلابی تحریک کے آغاز میں لوگوں کو صبر، تحملِ شدائد، اور توکل علی اللہ کی تعلیم و تربیت دیے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ جہاں ایک نظام تمدن و سیاست پوری طاقت کے ساتھ زمین پر چھایا ہوا ہو اور تمام وسائل و ذرائع زندگی اسکے قبضہ و اختیار میں ہوں، ایسی جگہ کوئی جماعت انقلاب کے لیے اٹھ نہیں سکتی جب تک کہ وہ جان و مال کی محبت دل سے نکال نہ دے، سختیاں اٹھانے کو تیار نہ ہو جائے، اپنے بہت سے فوائد کو قربان کرنے اور بہت سے نقصانات کو گوارا کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ حاضر الوقت نظام سے لڑنا دراصل تمام آفات و مصائب کو اپنے اوپر دعوت دینا ہے۔ یہ کام جنہیں کرنا ہو انہیں ایک پتھر کھا کر دوسرے پتھر کے لیے تیار رہنا چاہیے، اگر ہاتھ سے جاتا ہو تو چوغہ بھی چھوڑ دینے کے لیے آمادہ ہونا چاہیے، اور روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد ہو جانا چاہیے۔ خزائن رزق فی الوقت جنکے ہاتھ میں ہیں، ظاہر ہے کہ ان سے لڑ کر رزق پانے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا جو اسباب سے قطع نظر کر کے صرف خدا کے بھروسے پر اس راہ میں چھلانگ لگا سکتا ہو وہی ان سے لڑ سکتا ہے۔

"اے محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ، میں تمہیں آرام دونگا۔ میرا جوا اپنے اوپر اٹھا لو۔ . . . کیونکہ میرا جوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا۔" (متی ۱۱ : ۲۸ - ۳۰)

شاید حکومت الٰہیہ کا مینی فسٹو اس سے زیادہ مختصر اور پر اثر الفاظ میں مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ انسان پر انسانی حکومت کا جوا بڑا ہی سخت اور بڑا ہی بوجھل ہے۔ اس بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کو الٰہی حکومت کا نقیب جو پیغام دے سکتا ہے وہ یہی ہے کہ جس حکومت کا جوا میں تمہارے اوپر رکھنا چاہتا ہوں وہ نرم بھی ہے اور خفیف بھی۔

"غیر قوموں کے بادشاہ ان پر حکومت چلاتے ہیں۔ اور جو ان پر اختیار رکھتے ہیں وہ خداوند نعمت کہلاتے ہیں۔ مگر تم ایسے نہ ہونا بلکہ جو تم میں بڑا ہے وہ چھوٹے کے مانند

اور جو سردار ہے وہ خدمت کرنے والے کے مانند بنے" (لوقا ۲۲: ۲۵-۲۶)

مسیح علیہ السلام یہ ہدایت اپنے حواریوں یعنی صحابیوں کو فرماتے تھے۔ اس مضمون کے متعدد اقوال انجیلوں میں موجود ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ کہیں فرعونوں اور نمرودوں کو ہٹا کر تم خود فرعون و نمرود نہ بن جانا۔

"فقیہ اور فریسی[1] موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں، پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جنکا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ انہیں اپنی انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھانے کو کرتے ہیں۔ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربّی کہلانا پسند کرتے ہیں۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو، نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دوگنا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔"

"اے اندھے راہ بتانے والو! تم مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کے

---

[1] فریسی سے مراد حاملانِ شریعت ہیں۔

لِمَ تقولون ما لا تفعلون

علما کی بعینہ یہی حالت ... وہ سارے ... اور ... ازار ... تفسیر ...

... ۸۰ ... بادشاہ ... حاکم ...

مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو" (متی ۲۳: ۲ - ۲۸)

یہ اُس وقت کے حاملانِ شریعت کا حال تھا۔ وہ علم رکھنے کے باوجود محض بندگیٔ نفس کی وجہ سے آپ بھی گمراہ تھے اور عام لوگوں کو بھی گمراہ کر رہے تھے اور اس انقلاب کے راستہ میں رومی قیاصرہ سے بڑھ کر وہی حائل تھے۔

"اُس وقت فریسیوں نے جا کر مشورہ کیا کہ اسے کیونکر باتوں میں پھنسائیں۔ پس انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوں[۱] کے ساتھ اسکے پاس بھیجا اور انہوں نے (یعنی شاگردوں نے) کہا کہ اے استاد! ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پروا نہیں کرتا۔ ۔ ۔ ۔ ہمیں بتا تو کیا سمجھتا ہے قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں؟ یسوع نے انکی شرارت جان کر کہا اے ریاکارو! مجھے کیوں آزماتے ہو؟ جزیہ کا سکہ مجھے دکھاؤ۔ وہ ایک دینار اسکے پاس لے آئے۔ اس نے ان سے کہا یہ صورت اور نام کس کا ہے؟ انہوں نے کہا قیصر کا۔ اس پر اس نے کہا پس جو قیصر کا ہے قیصر کو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو" (متی ۲۲: ۱۵ - ۲۱)

اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل ایک چال تھی۔ فریسی اِس تحریک کو ختم کرنے کے لیے چاہتے تھے کہ حضرت مسیح کا قبل از وقت حکومت سے تصادم کرا دیا جائے اور تحریک کے جڑ پکڑنے سے پہلے حکومت کے زور سے اسکو کچلوا ڈالا جائے۔ اسی لیے ہیرودی ریاست کی سی آئی ڈی کے سامنے

[۱] مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں فلسطین کے ایک حصہ میں ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی طرح ایک یہودی ریاست قائم تھی جو سلطنت روم کی تابع فرمان تھی۔ اسکے بانی ہیرود کے نام پر اسکو عموماً ہیرودی ریاست کہتے تھے۔ ہیرودیوں سے مراد اس ریاست کی پولیس یا سی آئی ڈی کے آدمی ہیں۔

سوال اٹھایا گیا کہ قیصر کو ٹیکس دیا جائے یا نہیں۔ جواب میں حضرت مسیح نے جو ذو معنی بات کہی اسکو دو ہزار برس سے مسیحی اور غیر مسیحی سب اس معنی میں لے رہے ہیں کہ عبادت خدا کی کرو اور اطاعت ہر اُس حکومت کی کرتے رہو جو تمہارے زمانے میں موجود ہو۔ لیکن دراصل مسیح علیہ السلام نے نہ تو یہ فرمایا کہ قیصر کو ٹیکس دینا روا ہے، کیونکہ ایسا کہنا اُنکی دعوت کے خلاف تھا، اور نہ یہ فرمایا کہ اسے ٹیکس نہ دیا جائے کیونکہ اس وقت تک اُن کی تحریک اس مرحلہ پر نہیں پہنچی تھی کہ ٹیکس روکنے کا حکم دیا جاتا، اسلیے انہوں نے یہ لطیف بات کہہ دی کہ قیصر کا نام اور اس کی صورت تو قیصر ہی کو واپس کر دو، اور سونا جو خدا نے پیدا کیا ہے وہ خدا کی راہ میں صرف کرو۔

اس سازش میں ناکام ہونے کے بعد فریسیوں نے خود مسیح کے حواریوں میں سے ایک کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ کسی ایسے موقع پر مسیح کو گرفتار کرائے جبکہ عام بلوے کا خطرہ نہ ہو۔ چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور یہوداہ اسکریوتی نے مسیح کو پکڑوا دیا۔

"پھر ان کی ساری جماعت اٹھ کر اسے پیلاطس (رومی حاکم) کے پاس لے گئی اور انہوں نے اس پر الزام لگانا شروع کیا کہ اسے ہم نے اپنی قوم کو بہکاتے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتے اور اپنے آپ کو مسیح بادشاہ کہتے پایا۔ ..... پیلاطس نے سردار کاہنوں اور عام لوگوں سے کہا کہ میں اس شخص میں کچھ قصور نہیں پاتا۔ مگر وہ اور بھی زور دے کر کہنے لگے کہ یہ تمام یہودیہ میں بلکہ گلیل سے لیکر یہاں تک لوگوں کو سکھا سکھا کر ابھارتا ہے .... وہ چلّا چلّا کر سر ہوتے رہے کہ اسے صلیب دی جائے اور ان کا چلّانا کارگر ہوا" (لوقا ۲۳ : ۱-۲۳)

اسی طرح دنیا میں مسیح علیہ السلام کا مشن اُن لوگوں کی بدولت ختم ہوا جو اپنے آپ کو

حضرت موسیٰ کا وارث کہتے تھے۔ تاریخی شواہد کی رو سے حضرت مسیح کی نبوت کا کل زمانہ ڈیڑھ سال اور تین سال کے درمیان رہا ہے۔ اس مختصر مدت میں انہوں نے اتنا ہی کام کیا جتنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مکی زندگی کے ابتدائی دو تین سال میں کیا تھا۔ اگر کوئی شخص انجیل کی مذکورہ بالا عبارات کا مقابلہ قرآن مجید کی مکی سورتوں اور زمانۂ قیام مکہ کی احادیث سے کرے گا تو دونوں میں بڑی مماثلت پائیگا۔

جماعتِ اسلامی کی تشکیل

جو کچھ عرض کیا جاچکا ہے اُس سے تین حقیقتیں پوری طرح واضح ہو جاتی ہیں:

ایک یہ کہ اسلام کا مقصد زندگی کے فاسد نظام کو بالکل بنیادی طور پر بدل دینا ہے،

دوسرے یہ کہ یہ کلی و اساسی تغیر صرف اُسی طریق پر ممکن ہے جو انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا تھا،

تیسرے یہ کہ مسلمانوں میں اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے اور جو کچھ اب ہو رہا ہے وہ نہ اس مقصد کے لیے ہے اور نہ اس طریقہ پر ہے۔

اس توضیح کے بعد بلا کسی تمہید کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو صحیح معنوں میں "جماعتِ اسلامی" ہو اور اسلامی نصب العین کے لیے اسلامی طریق پر کام کرے۔

ایسی ایک جماعت کی تشکیل کس طرح ہو اور اُس کا ابتدائی پروگرام کیا ہو؟ ان دونوں سوالات پر بھی میں گزشتہ صفحات میں کافی روشنی ڈال چکا ہوں۔ خصوصاً میرا مضمون "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" تو انہی دو سوالوں کے جواب پر مشتمل ہے۔ لیکن عام طور پر دماغ اِن چیزوں سے اس قدر اجنبی

ہو چکے ہیں کہ سب کچھ سننے کے بعد کہتے ہیں "پروگرام لاؤ" گویا جو کچھ کہا گیا ہے اُس میں تو کوئی پروگرام تھا ہی نہیں۔ اسلیے یہاں جماعتِ اسلامی کے طریق تشکیل کو پوری طرح کھول کر دفعہ وار بیان کیا جاتا ہے۔ اسکے بعد اگر موجودہ پارٹیوں میں سے کوئی پارٹی اپنے دستور العمل اور پروگرام کو اس نقشہ کے مطابق تبدیل کرے تو نہایت خوشی کی بات ہوگی، ورنہ ایک نئی جماعت بنانے کے سوا کوئی چارہ نہیں:

(۱) جماعت اسلامی میں کوئی شخص محض اس مفروضہ پر شامل نہیں ہو سکتا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہوگا۔ اسی طرح کوئی شخص کلمۂ طیبہ کے الفاظ کو بے سمجھ بوجھے محض زبان سے ادا کر کے بھی اس جماعت میں نہیں آسکتا۔ اس دائرے میں آنے کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ آدمی کو کلمۂ طیبہ کے معنی و مفہوم کا علم ہو، وہ جانتا ہو کہ اس کلمہ میں نفی کس چیز کی ہے اور اثبات کس چیز کا، اور اس نفی و اثبات کی شہادت دینے سے اُس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اور یہ شہادت اُسکے طرزِ خیال و طرزِ زندگی میں کس قسم کے تغیر کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد جو شخص اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً رسول الله کہنے کی جرأت کرے صرف وہی جماعت اسلامی میں داخل ہو سکتا ہے، خواہ وہ پیدائشی غیر مسلم ہو اور ابتداءً یہ شہادت ادا کرے، یا پیدائشی مسلمان ہو اور از سرِ نو ایمان لائے۔

پیدائشی مسلمانوں کے کسی بڑے مجمع میں جوشیلی تقریر کے بعد لوگوں سے شہادت کا مطالبہ کرنا صحیح طریقہ نہیں ہے، کیونکہ دین آبائی سے جو روایتی دلچسپی اُنکے اندر موجود ہے اسکی بنا پر وہ کسی احساس ذمہ داری کے بغیر بلا تامل کلمہ پڑھ دینگے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ فرداً فرداً انکے سامنے کلمہ کے مفہوم کو اسکی ذمہ داریوں اور مقتضیات کے ساتھ پیش کیا جائے، اور جب وہ سوچ سمجھ کر شہادت ادا کریں تب انہیں جماعت میں داخل کیا جائے۔

کلمۂ شہادت کے سوا اس جماعت میں داخل ہونے کے لیے کوئی داخلہ کی فیس یا رکنیت کی فیس نہیں ہے۔

(۲) اداے شہادت کے بعد فوری تغیر جو ایک شخص کو اپنی زندگی میں کرنا ہوگا وہ یہ ہے:

(الف) فرائض کو اُنکی شرعی پابندیوں کے ساتھ ادا کرے،

(ب) کبائر سے اجتناب کرے اور اگر نادانستہ کسی کبیرہ کا مرتکب ہو جائے تو اس سے توبہ کرے،

(ج) اگر وہ کوئی ایسا ذریعۂ معاش رکھتا ہو جو معصیت فاحشہ کی تعریف میں آتا ہے، مثلاً سود، شراب، زنا، رقص و سرود، شہادت زور، رشوت، خیانت، قمار، قتال فی غیر سبیل اللہ وغیرہ تو اسکو ترک کر دے بلا اس لحاظ کے کہ اسکے ترک کرنے میں کتنا ہی نقصان ہو، اور اگر اسکی معاش میں ان وسائل کا کوئی حصہ ہو تو وہ اس حصہ سے اپنی معیشت کو پاک کرے،

(د) اگر اسکے قبضہ میں ایسا مال (یا جائداد) ہو جو حرام طریقہ سے آیا ہو، یا جس میں حق داروں کے تلف کردہ حقوق شامل ہوں تو اس سے فوراً دست بردار ہو جائے اور اہلِ حقوق کو انکے حق پہنچا دے،

(ہ) اگر وہ کسی مجلسِ قانون ساز کا رکن ہو تو اس سے مستعفی ہو جائے کیونکہ قانون سازی صرف خدا کا منصب ہے اور انسان کا قانون ساز بننا خدائی کے دعوے کو متضمن ہے۔

(و) اگر وہ کسی غیر الٰہی نظام کی طرف سے خطاب رکھتا ہو تو اسکو واپس کرے اور اُن وفاداریوں اور نیازمندیوں سے باز آئے جنکی بدولت اس نے خطاب پایا تھا، یا جنکو اب خطاب یافتہ ہونے کی وجہ سے نباہنا پڑتا ہے۔

(ز) کسی غیر الٰہی نظام عدالت میں اپنا مقدمہ نہ لے جائے خواہ اس پابندی سے اسکو کتنا ہی ضرر پہنچتا ہو (البتہ اگر کوئی دوسرا شخص اسکو کسی مقدمہ میں گھسیٹ لے تو جائز طریقہ سے اپنی مدافعت کرسکتا ہے نہ اس حیثیت سے کہ یہ نظام عدالت برحق ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ جب مدعی اس پر حملہ آور ہوا ہے تو اسے دفع کرنا ہے)

یہ تغیرات جس شخص کی زندگی میں فوراً رونما نہ ہوں اسکے متعلق یہ سمجھا جائیگا کہ وہ کلمۂ شہادت ادا کرنے میں صادق نہ تھا اور اس بنا پر وہ جماعت میں نہ لیا جائیگا یا لیا جا چکا ہے تو خارج کیا جائیگا۔

(۳) ادائے شہادت کے بعد بتدریج جو تغیرات ہر شخص کو اپنی زندگی میں کرنے ہونگے وہ یہ ہیں:

(الف) دین کا کم از کم اتنا علم حاصل کر لینا کہ اسلام اور جاہلیت کا فرق معلوم ہو اور حدود اللہ سے واقفیت حاصل ہو جائے (ب) تمام معاملات میں اپنے نقطۂ نظر، طرزِ خیال اور طرزِ عمل کو ہدایت الٰہی کے مطابق ڈھالنا، اپنی زندگی کے مقصد، اپنی پسند اور قدر کے معیار، اور اپنی وفاداریوں کے محور کو تبدیل کر کے رضائے الٰہی کے موافق بنانا، اور اپنی خودسری و نفس پرستی کے بت کو توڑ کر تابع امرِ رب بن جانا۔ (ج) اُن تمام رسوم جاہلیت سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے خلاف ہوں، (د) تمام اُن تعصبات اور دلچسپیوں سے اپنے قلب کو، اور اُن مشاغل اور جھگڑوں اور بحثوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جنکی بنا نفسانیت یا دنیا پرستی پر ہو اور جنکی کوئی اہمیت دین میں نہ ہو۔

(ھ) فاسقین و فجار اور خدا سے غافل لوگوں سے ربط و تعلق توڑنا اور صالحین سے ربط قائم کرنا، (و) اُن تمام اداروں سے تعلق منقطع کرنا جو جاہلیت کی خدمت کرتے ہوں اور جنکا مقصد حاکمیت رب العالمین کے قیام و اثبات کے سوا کچھ اور ہو، (ایسے اداروں کے ساتھ وقتی ضروریات کے لحاظ سے تعاون یا صلح و موادعت کے معاملات کیے جا سکتے ہیں، مگر یہ افراد کا کام نہیں جماعت کا کام ہے۔ کوئی مسلمان انفرادی طور پر ایسے کسی ادارے کا جزء نہیں بن سکتا)

(ز) اپنے معاملات کو راستی، عدل، خدا ترسی، اور بے لاگ حق پرستی پر قائم کرنا، (ح) اپنی دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کو قیامِ دینِ حق کے نصب العین پر مرتکز کر دینا اور اپنی ضروریات زندگی کے ماسوا اُن تمام مصروفیتوں سے دست کش ہو جانا جو اس نصب العین کی طرف نہ لے جاتی ہوں۔

ضروری نہیں کہ یہ تغیرات تمام اشخاص میں کمال درجہ پر ہوں، مگر ہر شخص کو اس باب میں اپنی تکمیل کی کوشش کرنی ہوگی کیونکہ انہی تغیرات کے اعتبار سے ناقص یا کامل ہونے پر جماعت اسلامی میں آدمی کے مرتبے کا تعین ہوگا۔

(۴) جو لوگ غیر الٰہی نظام حکومت کو چلانے میں آلہ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں یا غیر الٰہی قانون کے اجراء میں مددگار بنتے ہیں انکی تین حیثیتیں ہیں:

اگر وہ اپنے اس کام پر خوش اور مطمئن ہیں اور اپنے اس کسب کو حلال و طیب سمجھتے ہیں اور اسی راہ میں ترقی

درجات کے متمنی ہیں تو انکے لیے اس دائرے میں کوئی جگہ نہیں۔

آگر وہ اس نظام کو غلط اور اپنے کسب کو حرام سمجھتے ہیں، مگر اعتراف گناہ کے باوجود اسکو محض ضعفِ ایمانی کی وجہ سے ترک نہیں کرسکتے تو وہ جماعت اسلامی کے طبقۂ سوم میں (جسکی تشریح آگے آتی ہے) داخل ہوسکتے ہیں۔

اگر وہ محض اس مجبوری سے اس نظام میں منسلک رہیں کہ کوئی دوسرا ذریعۂ زندگی نہیں پاتے، اور نیک نیتی کے ساتھ اس بات کے لیے تیار ہوں کہ دوسرا ذریعہ پاتے ہی اسے ترک کر دینگے تو وہ جماعت اسلامی کے درجہ دوم میں (جسکی تشریح آگے آتی ہے) داخل ہوسکتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ غیر الٰہی نظام اطاعت کے ایک جزء اور دوسرے جزء میں کوئی فرق نہیں۔ اسکے جو اجزاء بظاہر بالکل معصوم نظر آتے ہیں وہ بھی اسی قدر ناپاک ہیں جسقدر دوسرے غیر معصوم اجزاء۔ نیز جو غیر الٰہی نظام اطاعت مسلمانوں کی خداوندی میں چل رہا ہے وہ بھی اپنے تمام اجزاء سمیت اسی حکم میں ہے۔ مسلمان کی خداوندی اسکو ہرگز کوئی سندِ طہارت عطا نہیں کرتی۔

(۵) جہاں ایک شخص متذکرۂ صدر طریقہ پر ایمان لائے، اسکے لیے لازم ہے کہ ایک طرف اپنے حلقۂ تعارف میں دوسرے مردوں اور عورتوں کو دعوتِ ایمان دے، اور دوسری طرف اپنی بستی میں ان لوگوں کو تلاش کرے جو اسکی طرح ایمان لائے ہوں۔ پھر جہاں ایسے دو آدمی بھی ملجائیں وہاں انکو عارضی طور پر جماعتی ہئیت بنالینی چاہیے، اس نیت کے ساتھ کہ جب بڑی جماعت بننے کی نوبت آئے یا انکو معلوم ہو کہ مرکزی جماعت بن گئی ہے تو وہ بلا تامل اس میں شامل ہو جائیں۔ (اس قسم کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کا اپنی مستقل امارتوں کے جھنڈے بلند کرنا اور اپنے علحدہ وجود کو باقی رکھنے پر اصرار کرنا انکے صدقِ ایمانی کا نہیں بلکہ انکی نفسانیت کا ثبوت ہوگا)

(۶) جو لوگ نظام جماعت میں شامل ہوں انکو انکے حالات کے لحاظ سے ابتداءً تین طبقوں میں منقسم کیا جائیگا:

ا۔ ایسے اشخاص جو تن من دھن سے جماعت میں شریک ہوں، جو اسلامی نصب العین کے حصول کی جد و جہد میں ہر قربانی کے لیے تیار ہوں، جو اپنے آپکو بلا کسی استحفاظ و استثناء کے اس طرح جماعت کے حوالہ کریں کہ جب انکو پکارا جائے لبیک کہیں، جو خدمت انکے سپرد کی جائے انجام دیں، اور جان، مال، اولاد، عزیز، اقارب، دوست غرض کسی چیز کو بھی مقصدِ اسلامی سے

زیادہ عزیز نہ رکھیں، وہ صفِ اول کے لوگ ہونگے، جماعت کا اصل کارکن و کارفرما عنصر وہی ہونگے، اور رہنمائی و سربراہ کاری انہی کے ہاتھ میں ہوگی۔

وہ لوگ جو اپنے آپکو بالکلیہ وقف کرنیکی طاقت نہ رکھتے ہوں اور نہ خطرات اور قربانیوں کا پورا بار اٹھا سکتے ہوں، مگر اپنے وقت اپنے مال اور اپنی قوتوں کا ایک حصہ اپنے نفس کی خدمت سے بچا کر راہِ خدا میں دینے کے لیے تیار رہیں، وہ طبقۂ دوم میں شمار ہونگے، بشرطیکہ اپنی شخصی زندگی کی حد تک احکام دین کی پوری اطاعت کریں، اُن وسائل کسبِ رزق اور اُن مشاغل سے مجتنب رہیں جو براہِ راست دینِ حق کے خلاف ہیں، اور صدق دل سے جماعت اسلامی کے خیر خواہ و وفادار رہوں۔ جماعت کی طرف سے انکے سپرد وہی خدمات کی جائینگی جنکو وہ خود بخوشی قبول کریں۔ ذمہ داری کا کوئی منصب انکے سپرد نہ کیا جائیگا۔ اور جماعتی مشوروں میں وہ شریک ہو سکینگے۔

جو لوگ کلمۂ اسلام پر اصولی حیثیت سے ایمان لائیں اور شخصی زندگی کی حد تک احکام شرعی کی پابندی بھی قبول کریں، مگر غیر الٰہی نظام سے انکے جو مفاد وابستہ ہیں اُنکا نقصان گوارا نہ کر سکیں وہ طبقۂ سوم میں داخل ہونگے اور انکا شمار صرف ہمدردوں میں ہوگا۔ بشرطیکہ وہ دوسری وفاداریوں پر خدا کی وفاداری کو مقدم رکھیں، غیر الٰہی نظام میں ترقی درجات کے لیے کوشاں نہ ہوں، اور جماعت اسلامی کو ہر جائز امکانی طریقہ سے مدد دیں۔ جماعتی مشوروں میں وہ صرف اُس حد تک شریک ہو سکتے ہیں جس حد تک جماعت کو انکے خلوص پر اعتماد ہو۔

طبقات کی یہ تقسیم تمام اشخاص کے حق میں دائمی و ابدی نہ ہوگی بلکہ شخصی حالات کے تغیر و تبدل کے ساتھ بدلتی رہیگی۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی طبقۂ سوم کے ایک شخص کی حالت بدل جائے اور وہ طبقۂ اول میں آ جائے اور علیٰ ھذا القیاس اسکے برعکس۔

(۷) اس جماعت کا ابتدائی پروگرام اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایکطرف اس میں شامل ہونے والے افراد اپنے نفس اور اپنی زندگی کا تزکیہ کریں، اور دوسری طرف جماعت سے باہر جو لوگ ہیں (خواہ وہ قومی مسلمان ہوں یا غیر مسلم) انکو بالعموم حاکمیت غیر اللہ کا انکار کرنے اور حاکمیت رب العالمین کو تسلیم کرنیکی دعوت دیں۔ اس دعوت کی راہ میں جبتک کوئی قوت حائل نہ ہو، انکو بھی اس سے چھیڑ چھاڑ کی ضرورت نہیں۔ اور جب کوئی قوت حائل ہو، خواہ وہ کوئی قوت ہو، تو ان کو اس کے علی الرغم اپنے عقیدہ کی تبلیغ کرنی ہوگی اور اس تبلیغ میں جو مصائب بھی پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہوگا۔

بعد کے مراحل کے متعلق اس وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جیسے حالات پیش آئینگے انہی کے لحاظ سے قدم اٹھایا جائیگا۔ البتہ لوگوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایک مضبوط جمے ہوئے اور زمین پر چھائے ہوئے دین کو اکھاڑ کر دوسرے دین کو قائم کرنا بہرحال آسان کام نہیں ہے۔ اس میں جان، مال اور ہر چیز کا زیاں ہے، لہذا وہی لوگ آگے بڑھیں جو تمام فائدوں اور آسائشوں کی قربانی اور تمام نقصانات کی برداشت کے لیے تیار ہوں۔

ضمیمہ ترجمان القرآن ماہ ہذا

ھُوَ الشَّافِی

بیسیوں مرتبہ کی آزمائی ہوئی، بے ضرر، سریع الاثر، مفید ترین دوائیں!

صرف ایک ہفتہ کیلئے مُفت

سنگرہنی دائمی پیچش اور تکلیف دہ اسہال کی بیماری پرانی ہو یا بہت دیر کی۔ بیمار بوڑھا ہو یا جوان۔ شافی مطلق کے فضل و کرم سے ایک ہفتہ میں پچاس فیصدی افاقہ ہوگا۔ اس نسخہ کو ایسے ایسے مریضوں پر آزمایا ہے جو بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں اور حکیموں کے علاج سے مایوس ہو چکے تھے۔ پہلی آٹھ خوراکیں مفت (درمیانی شیشی) البتہ محصولڈاک ضرورتمند حضرات کو ادا کرنا پڑے گا۔ جو آٹھ آنے ہے۔

اکسیر سعال (کھانسی)، کھانسی خشک ہو یا بلغمی۔ چھاتی میں سینے کی ہڈی کے نیچے خراش ہو۔ سانس تنگی کے ساتھ آئے۔ بار بار کھانسی کی تکلیف بے چین کرے۔ رات کو سوتے وقت اور صبح سویرے کھانسی کی زیادتی ہو اور شدت کے ساتھ کھانسی آئے تو علاج کی طرف فوراً متوجہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ پھیپھڑوں میں زخم ہو کر سل ہو جانیکا اندیشہ ہوتا ہے۔ ہمارے پچاس سالہ مطب میں اس دوا کا استعمال سب سے زیادہ نفع مند اور مفید ثابت ہوا ہے۔ اور اس کی مانگ سب سے زیادہ رہی ہے۔ خود آزما کر اسکا فائدہ دیکھئے۔ نمونہ مفت۔ محصولڈاک ۳؍ آنے۔

دار العلاج کی ممتاز خصوصیّت مردوں اور عورتوں کی مخصوص پوشیدہ بیماریوں کی تشخیص اور علاج کیلئے ایک معمّر، بزرگ نیک و صالح طبیب کی خدمات حاصل ہیں جنکا خاندان ہندوستان میں تین سو سال سے آجتک علم طب کے ذریعہ عوام الناس کی خدمت میں مصروف ہے۔ اور خود جنکو پچاس سال سے زیادہ عرصہ مطب کرتے ہوئے گزرا ہے۔ ضرورتمند حضرات تفصیلی خط و کتابت کے ذریعہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ جوابی امور کیلئے ٹکٹ کا آنا ضروری ہے۔ تمام خط و کتابت صیغہ راز میں رہیگی۔

مینیجر "دار العلاج" نیلا محل جالندھر شہر (پنجاب)

خـــالی صفحـــه

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت، قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت حصہ اول بےجلد ایکروپیہ آٹھ آنے قیمت مجلد دو روپیہ علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات } یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب اِن سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اِن اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد ۱/۴/- مجلد ۱/۸/- محصولڈاک -/۴/-

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابو الاعلیٰ مودودی

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سے سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدھا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنھوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کردیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انہیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

لیکن انسان کی کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہرعہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلواربند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذہنیت رکھنےوالی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحّص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کرلیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کما حقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بیجلد چار روپے مجلد پانچ روپے علاوہ محصولڈاک

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" - لاہور